www.urducouncil.nic.in

قیمت: ₹10/-

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

نومبر 2021

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

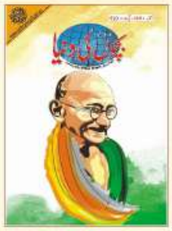

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

نئے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC:CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: magazines@ncpul.in
شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

اردو آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان
ماہنامہ خواتین دنیا
Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 5 شمارہ: 11 نومبر 2021

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی۔ 110020
مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	صدیقہ بیگم سیوہاروی کی افسانہ نگاری	ڈاکٹر شاداب تبسم	5
جہانِ نسواں	مولانا ابوالکلام آزاد اور ہند کا اتحاد	پروفیسر رفعت جمال	10
	ناول 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' ایک مطالعہ	ڈاکٹر صابرہ خاتون حنا	13
	تبسم فاطمہ کے افسانوں میں احتجاج	ڈاکٹر نزہت پروین	17
	سلمیٰ صنم کی افسانہ نگاری	ڈاکٹر عائشہ فرحین	21
	رضیہ سجاد ظہیر بحیثیت خاکہ نگار	ڈاکٹر بی بی رضا خاتون	24
	قیصر شمیم: شخص اور شاعر	صوفیہ محمود	30
	مولانا عبدالماجد دریابادی کی صحافت نگاری	سلیقہ جان	34
نکہتِ سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		38
افسانہ	صندل ہاتھ	شہانہ اقبال	39
	ادھورے خواب	ڈاکٹر نسرین بیگم (علیگ)	44
	جھوٹی مسکراہٹ	محمودہ قریشی	47
حسنِ سخن	ڈاکٹر نفیس بانو، عنبرین فاطمہ، نوشین تبسم		52
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		54
صحت	قے دوران حمل	ڈاکٹر احسان رؤف	56
آرائش و زیبائش			59
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		61
خواتین خبرنامہ			62

مشعل

اس وقت دنیا کے بیشتر ممالک ماحولیاتی آلودگی کو لے کر فکر مند ہیں۔تمام دنیا ماحولیاتی آلودگی کی زد میں ہے۔فضائی آلودگی،صوتی آلودگی، آبی آلودگی اور زمینی آلودگی نے مختلف شعبۂ حیات کو متاثر کیا ہے۔ ہمارے معاشرے پر ان آلودگیوں کے منفی اثرات پڑ رہے ہیں۔ماحولیات کا توازن بگڑ رہا ہے۔جس کی وجہ سے معاشرے میں طرح طرح کے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔

روزگار کی تلاش میں انسان کا شہروں کی طرف بھاری تعداد میں منتقل ہونا، جنگلات کا کٹنا، کارخانوں سے نکلتا دھواں اور اس سے نکلنے والے کیمیکل ملے پانی نے دریاؤں اور ندیوں کو آلودہ کر دیا ہے۔ماحولیاتی آلودگی کا اثر گلوبل وارمنگ اور مہلک بیماریوں کی صورت میں سامنے آرہا ہے۔ہم ماحولیات سے متعلق جن خطرات سے گزر رہے ہیں اس کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمیں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ فطرت اور ماحول کے تئیں ہمیں سنجیدہ ہونے کی ضرورت ہے۔

عورت اور فطرت کے درمیان ایک مضبوط رشتہ ہوتا ہے۔عورت فطرت کے بہت قریب مانی جاتی ہے لیکن موجودہ وقت میں جہاں انسانوں نے بہت ترقی کی وہیں فطرت سے چھیڑ چھاڑ اور قدرتی اشیا کو انسانوں نے بہت متاثر کیا ہے۔ایکو فیمنزم (Ecofeminism) کا تعلق بھی ماحول سے ہے۔اس میں حقوق نسواں کے ساتھ ساتھ فطرت اور ماحولیات پر بھی بات ہوتی ہے۔اس ضمن میں کچھ تحریکیں بھی چلیں۔خواتین کی یہ تحریکیں لوگوں کو ماحول کے تئیں بیدار رہنے کی تعلیم دیتی ہیں۔چپکو تحریک، گرین بیلٹ تحریک، فری گین ازم (Freeganism) تحریک اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔یہ تحریکیں انسانوں کو فطرت کے قریب کرتی ہیں اور یہ بتاتی ہیں کہ فطرت کے تئیں ہماری بھی ذمہ داری ہے۔آلودگی سے نجات کے لیے ہمیں ان تحریکوں کا حصہ بننا چاہیے۔ہمیں اس بات پر غور و فکر کرنا ہوگا کہ ہم اپنے عیش و آرام کے لیے فطرت کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔

ماحولیات کو لے کر ادبی سطح پر بھی بیداری آئی ہے اور خواتین اپنی تخلیقات میں ایکو فیمنزم کے ذریعے فطرت سے آگہی کا ثبوت دے رہی ہیں۔اگر دیکھا جائے تو ایکو فیمنزم ایک اہم سماجی فریضہ انجام دے رہی ہے۔خواتین فطرت کے تئیں سنجیدہ ہیں جس کا اظہار وہ اپنی نگارشات میں کر رہی ہیں۔ماحولیاتی تانیثیت صرف عورتوں کے مسائل سے ہی بحث نہیں کرتی بلکہ فطرت، آزادی، ماحول اور نباتات و حیوانات سے بھی محبت کا اظہار کرتی نظر آتی ہے۔

آج ماحولیات کو لے کر ہمارے سامنے بہت سے خطرات اور خدشات ہیں جو ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں کہ ہمیں اپنے طرز زندگی کو تبدیل کرنا ہوگا کیونکہ جب تک ہمارے طرز حیات میں تبدیلی نہیں آئے گی تب تک ہم ماحولیاتی بحران سے نجات نہیں پا سکتے۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاکٹر شاداب تبسم

صدیقہ بیگم سیوہاروی کی افسانہ نگاری

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جب ترقی پسند تحریک اپنے نقطۂ عروج پر تھی تو اس تحریک نے دنیا کی تمام زبانوں کے ادب کو متاثر کیا۔ علی گڑھ تحریک کے بعد ترقی پسند تحریک دوسری شعوری تحریک تھی جس کے زیر اثر ہمارے ادب کو بعض اہم تبدیلیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس تحریک نے اردو ادب میں نشاۃ الثانیہ لانے کا کام کیا جن لوگوں نے اردو ادب کے مختلف شعبوں کا توجہ سے مطالعہ کیا ہے ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ اردو زبان میں ایک بڑا ذخیرہ اس تحریک کی پیداوار ہے۔ اس تحریک نے یوں تو تمام ادبی اصناف کو متاثر کیا لیکن شاعری، افسانہ اور تنقید پر خاص اثر پڑا۔ ترقی پسند افسانے کو عروج پر پہچانے میں جن افسانہ نگاروں نے سعی کی ان میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، غلام عباس، بلونت سنگھ، اختر انصاری، ممتاز مفتی، شکیلہ اختر، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، رضیہ سجاد ظہیر، ہنس راج رہبر کے ساتھ صدیقہ بیگم سیوہاروی کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔

صدیقہ بیگم سیوہاروی کا آبائی وطن سیوہارہ ضلع، بجنور ہے۔ ان کی پیدائش 1925 کو لکھنؤ میں ہوئی۔ عمر کے ابتدائی دس سال لکھنؤ میں گذرے اور تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔ بعد میں اپنے والدین کے پاس سیوہاررہ چلی آئیں۔ ان کے والد بابو شفیع احمد بہت خوش حال زمیندار تھے۔ صدیقہ بیگم طفل شیر خواری ہی میں تھیں کہ ان کی والدہ کی رحلت ہوگئی لیکن سوتیلی ماں نے بہت پیار و محبت سے ان کی پرورش کی۔ گھر کا ماحول خالص مشرقی تھا ان کی تعلیم سخت ترین پردے میں ہوئی۔ اسی ماحول میں رہ کر انھوں نے قرآن شریف، اردو، عربی اور فارسی کی چند کتابیں پڑھیں۔ مثلاً راشد الخیری کی تصانیف، ڈپٹی نذیر احمد کے ناول اور کچھ اخلاقی کتابیں۔ اپنی اسی ابتدائی تعلیم کے تعلق سے کہتی ہیں:۔

''بس یہ گھر تھا میرا مدرسہ اور یہ کتابیں میرا بستہ

دوسری جگہ لکھتی ہیں:

''چند سال پہلے کی بات ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسا وقت آیا کہ دروازے پر موت نے دستک دی۔ بنگال بھوکا مرنے لگا۔ چالیس کروڑ انسانوں میں ہلچل مچ گئی۔ وہ رشتہ جس نے ہمیں ایک دوسرے سے منسلک کیا تھا ٹوٹنے لگا برسوں کی پالی ہوئی تہذیب کا جنازہ نکل رہا تھا۔ باپ اپنی بیٹی کو، مائیں اپنی اولاد کو، بھائی اپنی بہنوں کو ایک ایک دانے چاول پر بیچنے لگے۔'' (فسانہ۔ الہ آباد، 1948)

مضمون ''میں اور میرے افسانے'' میں ان تمام واقعات کا ذکر کیا ہے جو اس وقت رونما ہوئے۔ آخر میں لکھتی ہیں:

''یہی ہے وہ پس منظر جس پر ہمیں اپنے ادب کی بنیادوں کو دیکھنا ہے۔''

(فسانہ۔ الہ آباد، 1948)

ان کی ایک تحریر ''آخری خط کے عنوان'' سے 184 میں منظر عام پر آئی۔ اس تحریر میں انھوں نے اپنے عہد یعنی سیاست مسلم لیگ، کمیونسٹ پارٹی، ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد، قحطِ بنگال، فسادات کی تصویر اس طرح پیش کی ہے کوئی گوشہ خالی نہیں رہا۔ لکھتی ہیں:

''ہندوستان آزاد ہوگیا'' مجھے سردار جعفری کا وہ شعر یاد آیا

سنہرا دوپٹہ اڑھائیں گے ہم
ستاروں سے آنچل بنائیں گے ہم

اس سنہرے دوپٹے کی دھجیاں اڑنے لگیں۔ ستارے بکھرنے لگے۔ ہندوستان کا بٹوارہ ہوگیا۔ چلو ٹھیک ہے۔
لیکن یہ مارکاٹ یہ خون خرابہ کیسا بھائی بھائی کا خون بہا رہا تھا ہندوستان اور پاکستان کی سرزمین پر ایک ہی رنگ کا خون تھا سرخ خون۔'' (آخری خط، نقوش، 2/اکتوبر، 1956)

اس ''آخری خط'' میں جو شوہر کے نام ہے۔ آخر میں شوہر کے انتقال کا ذکر کیا ہے۔ لکھتی ہیں:

''تم چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے تمہارے ہاتھ میں قلم بھی نہیں تھا۔ تمہاری آنکھیں بند تھیں اور چاندنی نے تم کو نور کی چادر اڑھادی تھی۔ سفید سفید چادر۔ یہ تاریخ تھی 10 مارچ 1984 اور یہ کہانی یہیں ختم ہوگئی۔'' (آخری خط)

صدیقہ بیگم سیوہاروی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ حیدرآباد سے 1944 میں 'ہچکیاں' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ دوسری مرتبہ 1950 میں پربھات پبلیشر، پریاگ راج (الہ آباد) سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ کل دس افسانوں پر مشتمل ہے۔ پیش لفظ سید اعجاز حسین نے تحریر کیا ہے۔ مجموعے میں شامل افسانے 'تصویر'، 'آندھی' اور 'چاول کے دانے' کا موضوع قحطِ بنگال ہے۔ ''چاول کے دانے'' میں ضعیف آدمی کو بھوک کی شدت نے اتنا مجبور کردیا کہ وہ اپنی پوتی کی جان بچانے کے لیے اسے امیر سیٹھ کو صرف ڈیڑھ پاؤ چاول کے عوض میں بیچ آتا ہے۔ لیکن جب اس کا ضمیر اس پر ملامت کرتا ہے تو اس کے جذبات اور ذہنی کیفیت کو افسانہ نگار نے بہت ہی موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اپنے بیٹے نذیر کو بوڑھا شخص یاد کر کے کہتا ہے:

''ہائے اللہ کافی رات ہوگئی۔۔۔۔۔ شفو۔۔۔ میری شفو کا توٹھکانا ہو ہی گیا۔۔۔ نذیر سنے گا تو کیا کہے گا میں نے اس کی لڑی کو بیچ دیا ڈیڑھ پاؤ چاول پر۔۔۔۔ ڈیڑھ پاؤ چاول۔۔ معلوم نہیں وہ اس کے ساتھ کیسا برتاؤ کرے۔''

(ہچکیاں، چاول کے دانے، کریمی پریس، الہ باد، 1950)

قحط بنگال کے موضوع پر لکھی کہانی ''آندھی'' بہترین کہانی ہے۔ کہانی فلیش بیک میں چلی جاتی ہے۔ افسانے کی ہیروئن تارا کو اس کی ماں اناج کے عوض میں کوٹھے پر فروخت کردیتی ہے۔ ہیروئن اپنا ماضی یاد کرتی ہے۔ بھوک سے تڑپ کر مرتے ہوئے تارا کے بھائی کی موت کا نقشہ بہت ہی دردناک انداز میں کھینچا ہے۔

''بھیا کبھی کبھی آہستہ سے بولتا ''بھوک''۔ اب تو اس کی زبان بھی نہ دکھائی دیتی تھی تالو کو چپک گئی تھی۔ ہاں اس کے منھ سے ہرے ہرے جھاگ نکل رہے تھے تھوڑی دیر پہلے اس نے درخت کے پتے کھائے تھے۔''

(ہچکیاں، افسانہ، آندھی، ص 84)

تھیں۔ جنہیں میں بار بار پڑھتی تھی۔ جیسے کلام پاک کی تلاوت ہوتی ہے۔ فرق یہ تھا کہ یہ سمجھ میں آتی تھیں۔ اوران کو پڑھ کر لطف بھی آتا تھا۔ اس زمانے میں اردو کی بیشتر کتابیں پڑھنے کا موقع ملتا تھا۔"

(ضلع بجنور کے جواہر۔ فرقان احمد صدیقی، جید پریس، بلی ماران دہلی،۔ 1991،ص 87)

صدیقہ بیگم سیوہاروی کے بھائی اخلاق احمد وارثی پرانی قدروں کے سخت مخالف تھے۔ بھائی کو گونڈیا مدھیہ پردیش میں ملازمت مل گئی تو وہ ان کے ساتھ مدھیہ پردیش چلی گئیں۔ وہیں ان کے تخلیقی دور کا آغاز ہوا۔ ان کے افسانے وقتاً فوقتاً مختلف رسائل مثلاً عالم گیر، ساقی، ادیب، شاہکار، کلیم، ادبی دنیا، ادب لطیف میں شائع ہوتے رہے۔ سی پی قیام کے دوران ہی انھوں نے ایک رسالہ "نورس" نکالا۔ اس کے دو شمارے چھپے بعد میں ۱۹۴۷ کے ہنگاموں کی نذر ہوگیا۔ اس سے پہلے رسالہ "" آوازنسواں""" نیا راگ" کے نام سے ترتیب دے چکی تھیں۔ اس کے تعلق سے لکھتی ہیں:

"اس تجربے کو سید سجاد ظہیر، ممتاز حسین، اور دوسرے ادیبوں نے بہت سراہا۔"

(ضلع بجنور کے جواہر۔ فرقان احمد صدیقی، ص 87)

ستمبر 1947 میں ان کی شادی اطہر پرویز سے ہوئی اور ان کے ساتھ الہ آباد چلی گئیں۔ الہ آباد میں اردو رسالہ "فسانہ" کے ادارہ تحریر میں شامل ہوگئیں۔ 1950 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی گئیں وہاں رہ کر بہترین افسانے لکھے جو ریڈیو سے نشر ہوئے اور ادب لطیف، نقوش اور شاہرہ میں شائع ہوئے۔ 1956 میں شوہر کے ساتھ علی گڑھ چلی گئیں۔ وہاں ان کی ملاقات ڈاکٹر رشید جہاں سے ہوئی۔ ان کی رہنمائی میں ان کے فن میں مزید پختگی آئی۔ ان کے شوہر علی گڈھ میں شعبۂ اردو میں ریڈر تھے۔ 10 مارچ 1984 کو حرکتِ قلب بند ہونے سے ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ شوہر کے انتقال نے ان کے ذہن اور جسم دونوں کو مفلوج کر دیا۔ آخری دنوں میں یادداشت بھی باقی نہ رہی۔ 29 ستمبر 2012 کو علی گڈھ میں صدیقہ بیگم کی رحلت ہوگئی۔

صدیقہ بیگم سیوہاروی کا ادبی سرمایہ کل پانچ افسانوی مجموعوں مثلاً ہچکیاں، دودھ اور خون، پلکوں میں آنسو، ٹھیکرے کی مانگ، اور 'رقصِ بسمل' کے علاوہ رسائل میں شائع مختلف تحریروں اور دیگر مضامین پر مشتمل ہے۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں کی فہرست میں صدیقہ بیگم سیوہاروی کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ رشید جہاں کی شخصیت پر "رشید جہاں" کے عنوان سے مضمون لکھا جو نقوش کے "شخصیات نمبر" میں شائع ہوا۔ علی گڈھ کے دورانِ قیام ان کی ملاقات ڈاکٹر رشید جہاں سے ہوئی۔ اس ملاقات نے ان کی زندگی کی ڈگر ہی بدل دی۔ مضمون 'رشید جہاں' میں انھوں نے رشیدہ جہاں سے پہلی ملاقات کا نقشہ بہت ہی دلفریب انداز میں کھینچا ہے۔ اس سے رشید جہاں کی سیرت اور شخصیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ لکھتی ہیں:

"میں علی گڈھ امیر نشاں میں رہتی تھی اور مجھے آئے ہوئے مشکل سے پندرہ دن ہی ہوئے ہوں گے کہ دیکھتی کیا ہوں کہ بونے سے قد کی ایک خاتون چلی آرہی ہیں۔ جان نہ پہچان بی خالہ سلام۔۔۔۔ مردوں کی یہ بات مجھے پسند ہے کہ گھر میں مردانے میں بھی داخل ہوں گے تو دستک ضرور دیں گے۔ لیکن یہ خاتون چلی آئیں بس برسات کی سڑی گرمی پڑرہی تھی۔۔۔۔۔ کہتی تو کیا کہتی بیگماہیں کہ میرے سلام کا جواب دیئے بغیر کمرے میں گھسی چلی آرہی ہیں۔۔۔ میں سوچتی رہی کہ یہ اللہ ماری کون آگئی۔

لیکن چند سیکنڈ کے اندر جیسے زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ مجھے اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا۔

"تم صدیقہ ہو مجھے رشید جہاں کہتے ہیں۔"

ڈاکٹر رشید جہاں!!! میرے منھ سے بلا سوچے سمجھے نکل گیا"۔ "کیوں کیا رشید جہاں کافی نہیں"۔۔ انھوں نے بڑے پیار سے کہا جیسے کسی بچے کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی ہوں"۔

(رسالہ نقوش۔ شخصیات نمبر، ص908)

صدیقہ بیگم سیوہاروی کا ایک مضمون 'میں اور میرے افسانے' کے عنوان سے رسالہ 'فسانہ' اپریل 1948 کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے ان واقعات کا ذکر کیا ہے جو ان کے افسانوں کے محرک بنے۔ پہلی مرتبہ انھوں نے کہانی لکھی تو ان کے گھر میں طوفان برپا ہوگیا۔ جو ماحول پیدا ہوا اسی کے تعلق سے لکھتی ہیں:

"کل جب اس نے پہلے پہل قلم اٹھایا تھا اور اس کا نام رسالوں میں مردوں کے دوش بدوش چھپا تھا تو خاندانی عزت پر بٹہ لگ گیا تھا۔ اسلامی ننگ وناموس روایتوں کی ڈگر سے اتر کر ایک ایسی شاہ راہ پہنچ گیا تھا جہاں صوراسرافیل ہی اس کی منزل تھا۔ لیکن آج وہ ان حدود سے آگے بڑھ چکی ہے۔ ماضی کی فرسودہ روایتوں کو روندتے ہوئے آگے نکل گئی ہے۔" ("فسانہ"۔ الہ آباد، اپریل 1948)

افسانوی مجموعہ 'ہچکیاں' کے تعلق سے اعجاز حسین رقمطراز ہیں:

''ایک خاص بات جو فنی لحاظ سے سب سے پہلے ہم کو محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ افسانے کو رنگین بیانی یا پر جوش اور بھاری بھرکم الفاظ کا سہارا دے کر دلکش بنانے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ واقعات اور اہمیت اور تفصیل کو ایسے موقع اور ایسے سیدھے سادے الفاظ میں قلم بند کر دیا گیا ہے کہ افسانوی عنصر خود بخود پڑھنے والے کو مسحور کر لیتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ انداز بیان کہ جیسے کچھ نہیں کہا جا رہا ہے اور سب کچھ خود بخود ماحول سے یکجا ہو کر ذہن پر چھائے جا رہے ہیں''۔

(ہچکیاں، ص 14)

مجموعہ ''پلکوں میں آنسو'' پہلی مرتبہ 1948 میں (پریاگ راج) الہ آباد پبلشنگ ہاؤس سے شائع ہوا۔ اس کا پیش لفظ سہیل عظیم آبادی نے تحریر کیا ہے۔ ان افسانوں میں ''ہچکیاں'' میں شامل افسانوں کے مقابلے صدیقہ بیگم سیوہاروی کا احساس تیز اور نقطۂ نظر وسیع ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کا فن برابر ترقی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ بنگال کے قحط سے ان کے احساس کو سخت جھٹکا لگا۔ ان کے افسانوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بنگال کا قحط ان کے رجحانات، تصورات اور فن کا موڑ ہے۔ قحط بنگال کے بعد جو افسانے انھوں نے لکھے اس کے تعلق سے پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

''بنگال کی بھوک نے ان کے افسانوں میں زندگی کی تڑپ پیدا کر دی۔ ان کے خلوص کا بہاؤ تیز کر دیا۔ ان کے بیان کا زور بڑھا دیا۔ زندگی سے ہم آغوش کر دیا''

(پیش لفظ۔ پلکوں میں آنسو، ص 9)

مجموعہ ''دودھ اور خون'' پہلی مرتبہ 1953، دوسری مرتبہ 1957 میں سرفراز قومی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں شامل افسانوں کی کل تعداد 13 ہے۔ افسانہ ''راکھ اور چنگاری'' ایک طرف قلیل تنخواہ پانے والے انسان کی داستان ہے اور دوسری طرف نئی اور پرانی نسل کے تصادم کی تصویر پیش کرتا ہے۔ اردو ادب میں ہم جنس پرستی جیسے موضوع پر لکھے گئے افسانوں کی کمی نہیں ہے۔ اس ضمن میں صدیقہ بیگم سوہاروی کا افسانہ ''تارے لرز رہے ہیں'' قابل ذکر ہے۔

مجموعہ ''رقصِ بسمل'' اردو گھر علی گڈھ سے شائع ہوا۔ اس میں کل 8 افسانے شامل ہیں۔ مجموعے میں شامل افسانہ ''گلدان کے پھول'' کا موضوع تعدادِ ازدواج اور ان کا استحصال ہے۔ زبان و بیان کے تشبیہاتی انداز کے اعتبار سے یہ افسانہ ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ اس افسانے میں گلدان کا پھول علامتی اشارہ ہے۔ یعنی گلدان کا پھول عورت کی زندگی ہے جو مرجھا گیا تو گلدان میں دوسرا پھول لگا دیا گیا۔ گلدان وہی رہتا ہے پھول بدلتے رہتے ہیں۔ اولاد پیدا نہ ہونے کا ذمہ دار صرف عورت کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ عورت صرف مرد کی دلبستگی کا ذریعہ ہے۔ جنسیات کو طنز اور تیکھے انداز میں پیش کرنے کے ہنر سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ اس ضمن میں مجموعہ ''رقصِ بسمل'' میں شامل افسانہ ''بیمار'' کا نام لیا جا سکتا ہے۔

صدیقہ بیگم ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھنے والی افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کے مطالعے سے یہ نتائج اخذ ہوتے ہیں کہ بلاشبہ مشرقی عورت کے پیکر تراشنے میں انھیں مہارت حاصل ہے۔ عورتوں کے مسائل کے ہر گوشے سے پوری طرح واقفیت رکھتی ہیں۔ جہیز، آپسی تصادم، نفسیاتی الجھنیں، غریبی، جہالت، جنگِ آزادی، تقسیم ہند، قحطِ بنگال گویا انھوں نے ہر طرح کے موضوعات چاہے وہ سیاسی ہوں یا سماجی سب پر کامیاب افسانے لکھے۔ ان کے مطالعے سے زندگی کی رنگ برنگی تصویر نظر آتی ہے۔

ان کے افسانوں کے کردار سماج کے حقیقی لوگ ہیں۔ واقعات کی تفصیل اور اختصار دونوں طرح سے افسانوں کو آگے بڑھاتی ہیں۔ ان کا مطالعہ تاریخی، سیاسی اور مذہبی اعتبار سے بھی بہت وسیع ہے۔ وہ بچوں کی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں۔ ''رقصِ بسمل'' میں شامل افسانہ ''شیر اور ہرن'' اس کی عمدہ مثال ہے۔ بچوں کے ذہن میں کیسے کیسے تصورات نمودار ہو سکتے ہیں اس بات کا انھیں پورا اندازہ ہے۔ لکھتی ہیں:

''شیر دہاڑا۔ غرّ۔ غرّ۔ بچے چونک پڑے پھر پانچوں بچے سو گئے۔ رات بھر شیر کو مارنے کے لیے خواب میں تیر و کمان بناتے رہے۔''

(رقصِ بسمل۔ شیر اور ہرن)

کسی بھی ادیب کی تخلیق میں اس کا اسلوب سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ صدیقہ بیگم کے افسانوں کی زبان شگفتگی اور سادگی سے پر ہے۔ انھیں الفاظ کے انتخاب میں زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ خود بخود موقع محل کے لحاظ سے الفاظ آراستہ ہو جاتے ہیں۔ افسانہ ''پرانا کوٹ'' موضوع، زبان و بیان اور کردار نگاری سبھی اعتبار سے بہت کامیاب ہے۔ کہیں کہیں مشکل الفاظ اور فارسیت غالب آ جاتی ہے۔ مثلاً ''پلکوں میں آنسو'' میں لکھتی ہیں:

''قائدِ اعظم محمد علی جناح اور مہاتما گاندھی ادھر باہم سمجھوتا کرنے کے سلسلے میں ایک دوسرے سے گفت و شنید کر رہے

ہیں اور ادھر برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر چرچل سے امریکہ کے صدر مسٹر روز ولٹ کیوبک میں ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں مل رہے ہیں اور تیسری طرف جرمنی میں فاشزم کا خاتمہ ہو رہا ہے۔'' (پلکوں میں آنسو)

تاریخی شواہد گنوانے میں کبھی پیچھے نہیں رہتی قاری کو وہی احساس کراتی ہیں جو کرانا چاہتی ہیں۔ افسانہ ''رقص بسمل'' میں بھی تاریخی شواہد سے افسانے میں جان ڈال دی ہے:

''بھگت سنگھ مسکرا رہا تھا اس کے گلے کی رسّی کھل گئی تھی۔ جلیاں والا باغ میں قمقمے جل رہے تھے۔ چاندنی چوک کی خونیں لاشیں اپنا خراج وصول کر رہی تھی۔'' (رقص بسمل)

افسانوں کا مجموعہ ''ٹھیکرے کی مانگ'' میں شامل افسانے بھی زندگی کی تلخ حقیقت کو پیش کرتے ہیں۔

افسانہ ''یہ کہانی'' خاکہ نگاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ افسانے میں اپنی بھابھی کا خاکہ بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے اور طنزیہ تحریر سے اپنے بھائی کو بھی نہیں بخشا۔ طنز و مزاح کے تعلق سے ''ٹھیکرے کی مانگ'' میں شامل ان کے افسانے ''وکیل ہو تو ایسا'' دوست ہو تو ایسا قابل ذکر ہیں۔ اسی مجموعے میں دو افسانے ''ہڈی کا داغ'' اور ''ٹھیکرے کی مانگ ایک ہی طرز کے افسانے ہیں دونوں کا موضوع پرانی اور فرسودہ روایات سے بغاوت ہے۔ دونوں ترقی پسند افسانے کے زمرے میں آتے ہیں۔ افسانہ ''ثروت'' ایسے واقعات پر مبنی ہے جن کا ہمارے معاشرے میں واقع ہونا تعجب کی بات نہیں۔ یہ ایک نئی نویلی دلہن کی کہانی ہے جس کی زندگی دیکھتے ہی دیکھتے محرومی اور غموں کے سمندر میں غرق ہو جاتی ہے۔ موضوع کے لحاظ سے صدیقہ بیگم کے افسانوں میں کافی تنوع ہے۔ افسانہ ''یہ دھرتی کے بیٹے'' کسان کی جدوجہد کی سچی تصویر دکھاتا ہے۔ متوسط طبقے کی تصویر افسانہ ''کلرک'' اور ''اسکول ماسٹر'' میں صاف دکھائی دیتی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ اپنے موضوع کی تلاش ہر ماحول میں کر لیتی ہیں۔ بقول سہیل عظیم آبادی

''وقت کے لحاظ سے موضوع پر افسانہ لکھنے والوں میں کرشن چندر کے بعد صدیقہ بیگم کا ہی نام آتا ہے۔ بہت سے مواقع پر جب ہمارے دوسرے فنکار خاموش رہے ہیں تو کرشن چندر نے ہماری رہنمائی کی۔ اپنی پوری قوت اور صلاحیت کے ساتھ۔ اس لحاظ سے صدیقہ بیگم کی خدمات بھی نہیں بھلائی جاسکتیں۔ انہوں نے ہمیشہ وقت کی آواز پر لبیک کہا ہے اور جب بھی لکھا ہے پورے جوش کے ساتھ۔''

(پیش لفظ پلکوں میں آنسو۔ سہیل عظیم آبادی، ص 11)

وقار عظیم رقمطراز ہیں:

''صدیقہ بیگم موضوع کی تلاش میں مختلف دنیا کی سیر کرتی ہیں غریبوں کی بستیاں، امیروں کے محل، بنگال کے قحط زدہ علاقے، جذبات کی دنیا، ماضی کے تصورات ان مختلف فضاؤں میں انھیں کبھی کبھی ایسی دنیا مل جاتی ہے جو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اپنی ذاتی دنیا ہے۔ اس دنیا میں آ کر ان کے بیان میں بھی جوش پیدا ہو جاتا ہے اور کہانی میں بھی کہانی کی بات پیدا ہو جاتی ہے''۔

(نیا افسانہ، وقار عظیم، جناح پریس، دہلی، 1946، ص 200)

تقسیم ہند اور اس کے بعد رونما ہونے والے فسادات کو صدیقہ بیگم نے اپنے افسانوں میں پورے فنی شعور کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کے افسانے رقص بسمل، روپ چند، گوتم کی سرزمین، شیشے کے گھر، ''پرائے دیس میں'' شاہ کار افسانوں کی فہرست میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔ قیامت خیز ہنگاموں کا بیان صدیقہ بیگم نے اپنے افسانے ''گوتم کی سرزمین'' بہت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ماضی اور حال کی تصویر اپنی پوری فنی مہارت کے ساتھ بیان کی ہے۔ سیاسی رہنماؤں پر زبردست طنز بھی کیا ہے۔

مختلف موضوعات پر دوسرے کئی افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے۔ مثلاً منٹو، کرشن چندر، بیدی، عصمت چغتائی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور وغیرہ ان کے علاوہ صدیقہ بیگم ہم عصر افسانہ نگار بانو قدسیہ، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں وغیرہ نے بھی عورتوں کے مسائل فسادات، تقسیم ہند قحط بنگال کے علاوہ دیگر موضوعات پر افسانے لکھے اور اپنا مقام حاصل کر لیا۔ لیکن ہمارے ناقدین نے صدیقہ بیگم سیوہاروی پر اس طرح گفتگو نہیں کی جو دیگر افسانہ نگاروں کے حصے میں آئی۔ اس گفتگو میں دیگر افسانہ نگاروں سے صدیقہ بیگم سیوہاروی کا موازنہ مقصود نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ انھیں وہ مقام و مرتبہ ضرور ملنا چاہیے جس کی وہ مستحق ہیں۔

□□□

Dr. Shadab Tabassum

23/14, Zakir Nagar,

Okhla, New Delhi-110025

Mob.: 09999149012

مولانا ابوالکلام آزاد اور ہند کا اتحاد

پروفیسر رفعت جمال

شورش عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز میں

مولانا آزاد ہندوستان کی آزادی اور ایکتا کے علمبردار تھے وہ اسلامی تہذیب وتمدن کی عظیم دین تھے انھوں نے اپنے خیالات وجذبات کے ذریعہ ملک وقوم کی جو خدمت کی وہ قومی تاریخ کا اہم حصہ بن گئی۔قومی اتحاد، وطن پرستی اور انسان دوستی کا درس دیا اور ملک کی تعمیر وترقی میں وہ کردار نبھایا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ وہ ایک قومی رہنما اور ہندوستانی جنگ آزادی کے سچے سپاہی تھے ان کی روشن ذات زندگی بھر ہماری رہنمائی کرتی رہی۔ ہمیں حالات کے اندھیروں سے روشنی کی طرف لاتی رہی اور بھٹکنے سے بچاتی رہی۔ آج جبکہ ملک کی فضائیں مکدر ہوگئی ہیں ہماری زندگی کی کشتی بادِمخالف کے جھونکوں کی زد میں ہے۔ ہمیں اپنا محاسبہ کرنا ہوگا اور مولانا آزاد کی ذات سے روشنی کی کرنیں لینا پڑیں گی۔ ان کی اول پرستی کو اپنی زندگی میں اتارنا پڑے گا کیونکہ ان کی زندگی کا سب سے اہم پہلو ان کی اصول پرستی ہے انھوں نے اپنی زندگی میں جس نظریہ کو اہم سمجھا اس پر ہر ناگوار حالات میں ڈٹے رہے اور کہتے رہے کہ ——

"حق وصداقت کا پیغام ہر مذہب میں ہے اسلام یہ نہیں سکھاتا کہ دوسرے مذہب والوں سے پُرخاش رکھو۔ غلامی بہت بڑی لعنت ہے اس کو مل جل کر مٹانا چاہیے اس کا جنازہ جب ہی نکلے گا جب ہر ہندوستانی اپنے آپ کو ہندوستانی کہے گا"

آج ہم ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، جین پتہ نہیں کیا کیا بن گئے مگر کیا ہم فخر سے اپنے آپ کو ہندوستانی کہنے کے لائق بنے۔ موجودہ حالات میں جبکہ ساری دنیا میں انسانیت کا جنازہ نکل گیا ہے افراتفری کا عالم ہے ہمیں ضرورت ہے کہ ہم سچے ہندوستانی بنیں۔ اپنے ملک سے پیار کریں۔ اپنی راشٹریہ بھاشا کو اپنائیں۔ سچائی اور ایمانداری کو شعار زندگی بنائیں اور ایک اچھے انسان بنیں۔ جس کا درس قدم قدم پر ہمیں مولانا آزاد نے دیا تھا ان کے سیاسی سفر کا آغاز 1912 میں 'الہلال' کے اجرا کو کہہ سکتے ہیں جس نے قومی شعور پیدا کیا اور سیاسی شعور کو بیدار کر کے ملک میں تہلکہ مچا دیا پھر کیا ایوان حکومت میں زلزلہ آ گیا جس وقت مولانا نے اپنے پرچہ کے ذریعے آزادی اور ہندو مسلم اتحاد کا غلغلہ بلند کیا اس وقت ہماری قومی تحریک ابتدائی مرحلہ میں تھی مولانا کے انقلاب و آزادی کا جو پرجوش نعرہ لگایا اس سے ہند کے بام ودر لرز اٹھے اس کی گونج پورے ملک میں پھیل گئی کیونکہ انھوں نے انگریزوں کے ظلم کے خلاف سارے ہندوستانیوں کو ایک قوم ہو جانے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ مانتے تھے کہ حصول آزادی اور اس کی جدوجہد ان کا دینی اور ملی فریضہ ہے اور ہر مسلمان کو اپنے ہم وطنوں کے ساتھ اس آگ میں کود جانا چاہیے:

"آزادی کی راہ میں قربانی وجاں فروشی ان کا قدیم اسلامی ورثہ ہے ان کا اسلامی فرض ہے کہ ہندوستان کی تمام جماعتوں کو اس راہ میں اپنے پیچھے چھوڑ دیں۔ میری صدائیں بےکار نہ گئیں۔ مسلمانوں نے اب آخری فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے ہندو، سکھ، عیسائی اور پارسی بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے ملک کو غلامی سے نجات دلائیں" (قول فیصل، ص100)

اپنے ہم وطن ہندوؤں اور دوسرے طبقوں کے ساتھ مل کر آزادی کی لڑائی لڑنے کے لیے مولانا آزاد نے جن باتوں کو اہم سمجھا ان میں مشترکہ تہذیب اور متحدہ قومیت کے بنیادی اصولوں کو اولیت دی۔ انگریزوں کی 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' کی پالیسی نے ہندو مسلم اور دوسرے طبقوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا تھا اب ملک کی سالمیت کے لیے ضروری تھا کہ ہندوستانیوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ ان میں باہمی اتحاد کا

جذبہ پیدا کیا جائے۔ مشترکہ تہذیب کا احساس دلا کر، متحدہ قومیت اور افادیت کا جذبہ پیدا کیا جائے۔

''عزیزوں تبدیلیوں کے ساتھ چلو، یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لیے تیار نہ تھے بلکہ اب تیار ہو جاؤ، ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک رہا ہے، اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راتوں میں بچھا دو، جہاں اجالے کی ضرورت ہے''

(خطبات۔ اکتوبر 1947)

جب مولانا نے انقلابی غیر مسلموں کا اعتماد جیت لیا ان کی کوششیں رنگ لائیں اور ان کی بدولت ہندو انقلابیوں کے ساتھ مسلمان انقلابی آ ملے اور یہ سلسلہ کلکتہ سے شروع ہو کر شمالی ہندوستان تک جا پہنچا۔ ان کی خفیہ میٹنگیں ہونے لگیں۔ بدگمانیاں دور ہوئیں تو خفیہ پروگرام تشکیل پانے لگے کیونکہ ہم وطنوں کے درمیاں دوریاں بنانے میں بڑی حد تک غیر ملکی حکمران کی حکمت عملی تھی۔ انھوں نے کہا تھا:

''میں مسلمانوں سے خاص طور پر دو باتیں اور بھی کہوں گا۔ ایک یہ کہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ پوری طرح متفق رہیں اور اگر ان میں سے کسی ایک بھائی یا کسی ایک جماعت سے کوئی نادانی کی بات بھی ہو جائے تو اسے بخش دیں ...... دوسری بات یہ ہے کہ مہاتما گاندھی پر پوری طرح اعتماد رکھیں۔ اور جب تک وہ کوئی ایسی بات نہ چاہیں (اور وہ کبھی نہیں چاہیں گے) جو اسلام کے خلاف ہو۔ اس وقت تک پوری سچائی اور مضبوطی کے ساتھ ان کے مشوروں پر کاربند رہیں۔''

(ہفتہ وار اخبار پیغام، کلکتہ 16 ستمبر 1921، ص5)

اپنی اس مصلحت پسندی اور جادو بیانی سے مولانا آزاد نے ملک کے دو فرقوں کے درمیان ذہنی رفاقت اور اتحاد عمل پیدا کیا۔ تحریک آزادی کے یہ دو عظیم رہنما۔ گاندھی جی اور ابوالکلام آزاد اپنے اپنے میدان عمل میں مضبوطی سے جمے رہے کیونکہ مولانا آزاد اپنے صحیح العقیدہ مسلمان اور اسلامی تعلیم وتہذیب کا وارث ہونے پر ہمیشہ فخر رہا تو گاندھی جی ایک راسخ العقیدہ ہندو تھے لیکن دونوں کو ملک وقوم کی اجتماعی زندگی میں حد بندیاں گوارہ نہیں تھیں وہ خود ہی حقیقت سے آشنا تھے اور اہل وطن کو باور کرانا چاہتے تھے کہ جس سرزمین کی آب وہوا میں وہ سانس لے رہیں وہاں رونما ہونے والے حالات وواقعات دونوں طرف یکساں طور پر اثر انداز ہوں گے۔ ہم اپنی شخصی پہچان بنانے کے بعد بھی باہمی اتحاد واعتماد حاصل کر سکتے ہیں اس احساس کو عام کرنے کے لیے انھوں نے مسلمانوں کی غیرت کو ان الفاظ میں للکارا:

''اگر تم کہو کہ تاریخ ہند میں ہمارے لیے بھی شرف وعظمت کا باب ہوگا تو تم خاموش رہو اور مجھ سے کہو کہ میں اسے پڑھ دوں بے شک ایک باب ہوگا۔ مگر جانتے ہو اس میں کیا ہوگا کہ ہندوستان ملکی ترقی اور ملکی آزادی کی راہ میں بڑھا اور ہندوؤں نے اس کے لیے اپنے سروں کو ہتھیلی پر رکھا مگر مسلمان غاروں میں چھپ گئے۔ انھوں نے پکارا، مگر انھوں نے اپنے منھ اور زبان پر قفل چڑھا لیے...... اس کے بعد آنے والا مورخ لکھے گا کہ بالآخر وہ سب کچھ ہو جو ہونا تھا۔ بیسویں صدی میں کوئی ملک غلام نہیں رہ سکتا اور نہیں رہا لیکن دنیا یاد رکھے گی کہ جو کچھ ہوا اس قوم کی سرفرازی سے ہوا جو مسلم نہ تھی۔''

(ابوالکلام آزاد، سوانح حیات، عرش ملسانی، ص36-35)

ان الفاظ میں وہ غم وغصہ ہے جو اپنے ہم مذہبوں میں اس بصیرت کے فقدان کے ردعمل کے طور پر انھیں بے چین کیے ہوئے تھا یہ بے چینی تو ایک ہندوستانی کی تھی اور ایک مسلمان کی حیثیت سے بھی ان کے تصور میں اسلام صرف خداشناسی کا پیغام نہیں دیتا بلکہ خودشناسی کا درس بھی دیتا ہے:

''میرا یہ اعتقاد اس لیے ہے کہ میں ہندوستانی ہوں اس لیے ہے کہ میں مسلمان ہوں، اس لیے ہے کہ میں انسان ہوں............ میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر افراد اور ہر قوم کا پیدائشی حق ہے کوئی انسان یا انسانوں کی گھڑی ہوئی بیورو کریسی یہ حق نہیں رکھتی کہ خدا کے بندوں کو اپنا محکوم بنائے۔ محکومی اور غلامی کے لیے کیسے ہی خوشنما نام کیوں نہ رکھ لیے جائیں، لیکن وہ غلامی ہی ہے اور خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے پس میں موجودہ گورنمنٹ کو جائز حکومت تسلیم نہیں کرتا اور اپنا ملکی، مذہبی اور انسانی فرض سمجھتا ہوں کہ اس کی محکومی سے ملک وقوم کو نجات دلاؤں۔''

اس کے لیے مولانا آزاد 1920 سے پہلے آزادی جمہوریت اور غیر فرقہ وارانہ سیاست کا علم بلند کر چکے تھے اور اپنے آدرشوں کی خاطر قید و بند کی سختیاں بھی جھیل رہے تھے وہ پہلے مسلم رہنما ہیں انھوں نے بھرپور قوت کے ساتھ ہندوستان کی متحدہ قومیت کا تصور پیش کیا اور عوام وخواص میں رائج کرنے کے لیے اپنی تمام ذہنی صلاحتیں صرف کردیں۔ ساتھ ہی عالمگیر انسانی اخوت ومساوات پر بھی زور دیا اور مسلمانوں کو یاد دلایا کہ خدا کے نزدیک ایک انسان کو دوسرے انسان پر یا ایک انسانی گروہ کو دوسرے

انسانی گروہ پر برتری یا کوئی فضیلت حاصل ہوسکتی ہے تو صرف اس کے عمل صالح اور پاکیزہ کردار کی بدولت۔ دوسری کوئی وجہ اس برتری کو قائم نہیں کر سکتی۔ انھوں نے مسلمانوں کو یہ بھی یاد دلایا کہ جس خدا پر وہ ایمان رکھتے ہیں اس کی صفت رب العالمین ہے اور جس پیغمبر نے اس خدا کا پیغام تم تک پہنچایا ہے وہ رحمت اللعالمین میں کرایا تھا۔ ترجمہ

اے پیغمبر ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام عالموں کے لیے رحمت بنا کر' خطبہ اتحاد اسلامی یعنی اسلام کا امن آتشی محبت و صلح اور بھائی چارہ کا پیغام تمام انسانیت کے لیے ہے۔ یہ بات جتنی مولانا آزاد کے دور میں اہم تھی اس سے کہیں زیادہ ہندوستان کی سیاست اور جنگ آزادی کے لیے اہم تھی چونکہ ہندوستان ذہنی غلامی کی زنجیریں کاٹ کر مذہبی اختلافات کے گمراہ کن حالات اور خوف وہراس کے ماحول سے نکل کر اتحاد، اتفاق، حب الوطنی اور آزادی کے نئے تصور میں داخل ہو رہا تھا۔ مولانا آزاد نے قومی ایکتا کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ بڑی اہم ہیں قومی ماحول کو متاثر کرنے والے مولانا آزاد کے ان خیالات کے حقیقی معیار کو سمجھنے کے لیے ان کے ذہنی رجحانات کو اہمیت دینا پڑے گی۔ وہ بے پناہ ذہین اور غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے انھوں نے ملک کے اہم سیاسی مسائل پر اپنا دائرہ فکر مرکوز کر دیا تھا۔ وہ ان لوگوں کو منکرین حق قرار دیتے ہیں جو خدا کی عطا کردہ عقل کو استعمال نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

''یہ اللہ کا نا قابل تغیر قانون ہے کہ اگر آپ اپنی آنکھیں نہیں کھولتے تو سمجھ لیجیے ان پر تاریک پردہ پڑ جائے گا۔ اگر آپ اپنے کانوں کا استعمال نہیں کرتے تو آپ بہروں کے مانند ہو جائیں گے اگر آپ سوچنے سے انکار کر دیتے ہیں تو آپ کے عقل کی روشنی خود بخود مدھم اور دھندلی ہو جائے گی۔''

(خبرنامہ، جون، ص 17)

قوم و وطن کی فلاح و بہبود کے لیے مولانا اخبار نویسی اور پریس کو اہم ذریعہ اور وسیلہ مانتے تھے اور اس کے ذریعہ انھوں نے آزادی اور قومی یکجہتی کے پیام کو عام کیا اور اقوام عالم کو پوری انسانی برادری کا حصہ قرار دینا ایسے حالات میں جبکہ رنگ و نسل کی تفریق نے اس طرف متوجہ ہونے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی مولانا آزاد نے کہا:

''ہماری ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے، وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابل تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔''

مولانا آزاد ہندو مسلم اتحاد کے بہت بڑے حامی تھے اور چٹان کے مانند مضبوط رہے اس بات پر ہم مذہبوں کی برائی بھی لینا پڑی۔ ان کی ذات غیر معمولی علمیت کی حامی تھی جس پر کسی تعصب کا غلبہ کبھی نہیں ہونے پایا۔ ان کی شخصیت ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہندوستان کی اس گونا گوں تہذیب کی چھایا ملتی ہے جیسے بہت سے بیرونی دھاروں نے متاثر کیا تھا وہ ہندوستانی کلچر کے نمائندے تھے۔ انھوں نے ترجمان القرآن کے ذریعہ بتایا کہ بنیادی سچائیاں تمام مذاہب میں موجود ہیں۔ انھیں اس بات پر فخر تھا کہ وہ ایک ہندوستانی تھے اور ناقابل تقسیم ہندوستانی قومیت کے فرد تھے۔ وہ کہتے ہیں:

'' ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنی تعمیر سامانیوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں، جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو، ہماری بولیاں الگ الگ تھیں مگر ہم ایک زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے، مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر لیا''

آج کے بدلے ہوئے حالات میں ان الفاظ میں پوشیدہ پیغام ہم ہندوستانیوں کے لیے اتنا ہی اہم ہے جتنا اس وقت تھا جب یہ الہامی الفاظ امام الہند مولانا آزاد کی زبان مبارک سے نکل رہے تھے ہم اپنی قسمت کی تعمیر میں لگے تو مگر زندگی کا مکاں کچھ اور بن گیا۔ مقدر کے کھیل نرالے ہو گئے ملک کی فضائیں مکدر ہو گئیں ذہن غبار آلود ہو گئے ملک کی تقسیم کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مولانا آزاد کسی قیمت پر ملک کی تقسیم نہیں چاہتے تھے۔ جب ملک تقسیم ہو گیا تو آزاد ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح منھ تکتے رہ گئے۔ بقول شاعر

میری نماز جنازہ پڑھائی غیروں نے
مرے تھے جن کے لیے رہے وضو کرتے

□□□

Prof. (Mrs.) Rifat Jamal
Dept. of Urdu, Women's College
B.H.U, Banaras-221005 (UP)

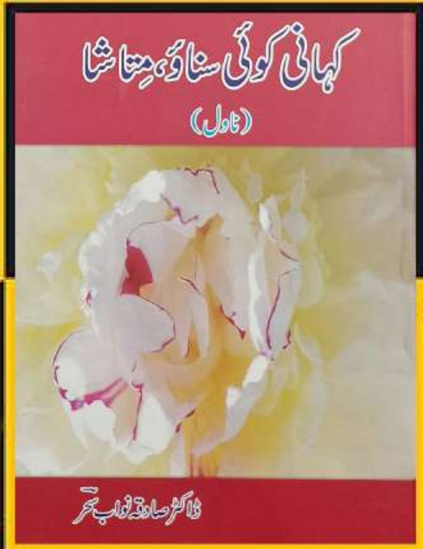

ڈاکٹر صابرہ خاتون حنا

ناول

'کہانی کوئی سناؤ متاشا' ایک مطالعہ

ناول 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کا پہلا ناول ہے جس کی اشاعت 2008 میں ہوئی اور اب تک اس کے تین ایڈیشن (دوسرا 2013 اور تیسرا 2021) میں شائع ہو چکے ہیں جو اس ناول کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ناول ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں زندگی کے سارے روپ دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایچ جی ویلز کے مطابق 'اچھے ناول کی پہچان حقیقی زندگی کی پیشکش ہے۔' اس تناظر میں زیرِ نظر ناول کا جائزہ یہ بتاتا ہے کہ حقیقی زندگی میں بطورِ خاص متوسط طبقہ کو جس طرح کے حالات سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے اس ناول میں اس کی خاطر خواہ عکاسی کی گئی ہے۔ اس کا پلاٹ بہت ہی گتھا ہوا اور بیانیہ مضبوط ہے اور ایک کے بعد ایک قصے کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ کہیں بھی کسی جوڑ یا پیوند کاری کا احساس تک نہیں ہوتا، واقعات بڑے ہی فطری اور منطقی انداز میں تسلسل کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں، حالانکہ یہ کہانی بظاہر ایک کردار متاشا کی ہے مگر اس متاشا کی زبانی اڑیسہ، کولکاتا، علی گڑھ، الہ آباد، بمبئی، پونے اور کئی چھوٹے چھوٹے قصبوں اور شہروں کے ساتھ ساتھ بے شمار کرداروں کی کہانیاں بھی زیبِ داستاں ہو گئی ہیں جس کی وجہ سے پلاٹ بھی اکہرا یا سادہ نہیں بلکہ مرکب ہو گیا ہے پھر بھی فاضل مصنفہ نے اس مرکب پلاٹ کو بھی بہت ہی کامیابی سے برتا ہے اور اس کی فنکارانہ ترتیب میں کامیاب رہی ہیں۔ جہاں تک ناول کے ایک اور جز قصہ یا کہانی کا سوال ہے تو یہ قصہ کہانیوں سے ہی بنا ہوا ناول ہے جنھیں چھوٹے چھوٹے عنوانات کے ذریعہ جوڑ کر اس ناول کی تکمیل کی گئی ہے بلکہ اگر عنوانات پر ہی غور کریں تو کم و بیش ہر ایک کے بطن سے ایک کہانی کا جنم ہوتا نظر آئے گا۔ پہلے ہی عنوان 'شاستری' کو دیکھیں 'میرے پردادا کے پردادا جگن ناتھ پوری مندر میں شاستری تھے' اور 'ننیہال' کا ابتدائی جملہ کچھ اس طرح ہے کہ 'میرے نانا کے پرنانا قنوج کے برہمن تھے اور زمیندار بھی' پورا منظر نامہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ ایک طرف اڑیسہ اور دوسری طرف مغربی بنگال، پھر دونوں خاندانوں میں دھرم پریورتن، برہمن سے عیسائی بننے کا دورانیہ، اسباب، نتائج، زمینداری کا خاتمہ، کاروبار اور پھر متاشا کے ددیہالی اور ننیہالی خاندان جو دو مختلف تہذیبی دھاراؤں کے امین ہونے کے باوجود ایک خاص نقطہ پر ایک دوسرے سے مل کر سمبندھی بن جاتے ہیں اور اس فطری سنگم کے بعد ان کے یہاں پہلی اولاد متاشا ہوتی ہے، بس یہیں سے اس بھرے پُرے اور بظاہر مہذب خاندان کی قلعی کھل جاتی ہے، جب بیٹی کی پیدائش پر ناول نگار کے قلم سے یہ جملہ خون بن کر ٹپکتا ہے۔ 'میرے پاپا کو لڑکیوں سے بڑی نفرت تھی۔' اور اس کے بعد سے ہی اصل کہانی کی ابتدا ہو جاتی ہے جو قدرتی بہاؤ کے ساتھ بڑی ہی خوبصورتی سے کچھ اس طرح آگے بڑھتی ہے کہ پڑھنے والوں کو اس پر سچ کا گمان ہونے لگتا ہے، حالانکہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات ہی دراصل کسی بھی کہانی

کے محرک بنتے ہیں لیکن ان واقعات میں رنگ آمیزی اور حقیقی مشابہت کی ذمہ داری فنکار کی ہوتی ہے۔ متاشا کی یہ کہانی درد سے عبارت ہے مگر اس درد کو سینے میں چھپائے وہ زندگی کے ہر میدان میں بلا خوف وخطر دوڑتی ہے یا یوں کہیں کہ ہر طرح کے مسائل کا مردانہ وار مقابلہ کرتی ہے۔ اب اس کی ذات کے گرد گردش کرتے یہ لوگ اور پھر ان لوگوں کی اپنی اپنی کہانیاں یہ سب مل کر ناول کی دلچسپی میں اضافے کا سبب بنتی ہیں اور قاری بغیر رکے تجسس کے ساتھ ناول کی قرأت میں مصروف رہتا ہے۔ صادقہ نواب نے بلاشبہ اس ناول میں افسانویت یا کہانی پن پر خصوصی توجہ دی ہے اور اسے برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں۔ بقول سلام بن رزاق:

''میر یز دیک فکشن کی پہلی شرط اس کا مطالعاتی وصف ہے اور یہ وصف 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اپنے تخلیقی اظہار، رواں دواں بیانیہ اور حقیقی کردار نگاری کے سبب یہ ناول شروع سے آخر تک قاری کو نہ صرف باندھے رکھتا ہے بلکہ ورق ورق اس کے اندر ایک دبی دبی سی کسک کا احساس بھی پیدا کرتا ہے، ناول کا مرکزی کردار 'متاشا' پورے ناول میں لہر لہر ڈوبتی اور گھاٹ گھاٹ ابھرتی ہے۔ ناول ختم ہو جاتا ہے مگر 'متاشا' قاری کے ذہن پر دیر تک دستک دیتی رہتی ہے''

(بحوالہ کتاب 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' کے بیک کور کی رائے)

واقعی 'تخلیقی اظہار، رواں دواں بیانیہ اور حقیقی کردار نگاری' اس ناول کی جان ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ناول ختم ہو جاتا ہے مگر 'متاشا' قاری کے ذہن پر دستک دیتی رہتی ہے۔ دراصل 'متاشا' ہمارے سماج کی صد فیصد نہ سہی نوے فیصد عورتوں کی مماثل ضرور ہے۔ صادقہ نواب نے بڑی ہی چابک دستی سے اس کردار کو خلق کیا ہے۔ وہ بچپن ہی سے مظلوم ہے، باپ کی نفرت اور ماں کی مار کھا کھا کر بڑی ہوئی ہے، اس کی خوبصورتی کی وجہ سے دادی کا پیار اس کے حصے میں آتا ہے مگر وہی خوبصورتی اس کے لیے دشواریوں کے پہاڑ بھی کھڑے کرتی ہے اور کبھی وہ سڑک چھاپ مجنوؤں کے رکیک ریمارک کا سامنا کرتی ہے تو کبھی اپنے باپ کے دوست موریشور کاکا کی ہوس کا نشانہ بنتی ہے، یہی نہیں وہ یوراج اور بھرت سے شادی نہ کرنے کا اصرار کر کے اپنے باپ کے ہاتھوں ذلیل وخوار بھی ہوتی ہے اور ماں سمیت گھر بدر بھی ہو جاتی ہے، اس کا عاشق پر بھاکر بھی اس سے نفرت کرنے لگتا ہے اور وہ لوگ دربدر کی ٹھوکریں کھاتے بالآخر علی گڑھ پہنچتے ہیں جہاں اس کا اپنا 'سوریہ کاکا' ہی اس کی عزت کے درپے ہو جاتا ہے۔ گھر اور بچوں کی کفالت کے لیے ماں سلائی کرنے لگتی ہے تو متاشا بھی ایک اسکول سے جڑ جاتی ہے لیکن بدقسمتی وہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑتی اور آخر وہ اپنے بھائی پرساد کے ساتھ ممبئی ایک رشتہ دار کے یہاں ٹھہر کر نوکری کی تلاش میں لگ جاتی ہے کچھ دنوں بعد رشتہ داروں کے یہاں سے بھی نکال دیا جاتا ہے اور وہ دونوں بھائی بہن اسٹیشن پر پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کئی بار نوکری ملتی اور کسی نہ کسی بہانے چلی جاتی، اسی طرح ڈوبتے ابھرتے پانچ بچوں کے باپ گوتم سے ملاقات ہوتی ہے جو کسی مسیحا کی طرح اس کے سامنے آتا ہے۔ دونوں کے درمیان ایک دوسرے کے خاندان کو سنبھالنے کے وعدے ہوتے ہیں، قسمیں کھائی جاتی ہیں، بالآخر متاشا اس ادھیڑ عمر شخص سے شادی کر لیتی ہے اور ایک بچے دیپیش یا دیپو کو جنم دیتی ہے۔ یہ گوتم کے پانچ بچوں اور اس کے بھانجوں کو بھی سنبھالتی ہے جبکہ گوتم وعدے کے مطابق اس کے بھائیوں کی تعلیم اور پھر ان کے روزگار پر دھیان دیتا ہے، سب کچھ ٹھیک چل رہا ہوتا ہے کہ درمیان میں 'موریشور' وہاں پہنچ کر اس کا گھر توڑنے کی کوشش کرتا ہے مگر تھوڑی تلخی کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ بالآخر چند برسوں کے بعد گوتم کی موت واقع ہو جاتی ہے اور متاشا کے سوتیلے بچے، اس کے اپنے بھائی بھاوج، سبھوں کا رویہ اس کے ساتھ ظالمانہ ہونے لگتا ہے اور وہ پھر سے اسی مقام پر آ جاتی ہے جہاں سے اس نے زندگی کی شروعات کی تھی، دکھوں کی اتھاہ گہرائی اسے ہر طرف سے گھیر لیتی ہے مگر وہ ہمت نہیں ہارتی اور اپنی بچی کھچی طاقت کو مجتمع کر کے ایک بار پھر اٹھ کھڑی ہوتی ہے، سوتیلے بیٹے انکت اور اپنے بھائی کے ساتھ مل کر گوتم کے کاروبار کو سنبھالنے کی کوشش کرتی ہے مگر انکت کے مکر وفریب اور اس کے ظلم وستم سے تنگ آ کر اپنے بیٹے دیپو کے ساتھ دور ایک گاؤں میں چلی جاتی ہے حالانکہ ابھی اس کے امتحان کے دن باقی تھے دیپو غلط صحبت میں پڑ کر نونیتا کو بن بیاہی ماں بنا دیتا ہے اور خود نشہ کرتے ہوئے سخت بیمار پڑ جاتا ہے۔ نونیتا روتی ہوئی اس کے پاس آتی ہے جسے دلاسہ دے کر اس کے بچے کی پرورش کی ذمہ داری بھی وہ خود ہی لے لیتی ہے تاکہ وہ آزادانہ طور پر کسی اور کے ساتھ اپنا گھر بسا سکے۔ یہاں ناول اپنے اختتام کو پہنچتا ہے مگر اس کا اختتامی جملہ 'اب کیسے جاؤ گی دادی'، ان ان دیکھی بیڑیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جن کی وجہ سے متاشا کو پھر سے زندگی کی طرف لوٹنا پڑتا ہے اور وہ اپنے بھائیوں، سوتیلے بچوں، بھانجوں اور اپنے بیٹے دیپو کی پرورش کرنے کے بعد اس کے بچے کی پرورش کا بار بھی اٹھانے کو تیار ہو جاتی ہے۔ متاشا کی شکل میں ناول نگار نے ایک بہت ہی فعال، متحرک اور پیچیدہ کردار کی تخلیق کی ہے جو ہمیشہ تغیر پذیر

ہے، وہ متاشا جو چار سال کی عمر میں ہی مار پیٹ کے ڈر سے جھوٹ بولنا شروع کرتی ہے اور زمانۂ طالب علمی میں اسی کے سہارے اپنی کئی غلطیوں کی پردہ پوشی کرتی ہے، وہ بالآخر عمر پختہ ہونے پر اس جھوٹ سے اپنا پیچھا چھڑا لیتی ہے، اس طرح وہ بزدل لڑکی دھیرے دھیرے اتنی سخت جان ہوجاتی ہے کہ زندگی کے سرد وگرم کا بڑی ہی ہمت اور استقلال کے ساتھ سامنا کرتی ہے اور حرف شکایت تک زبان پر نہیں لاتی یہ اور اس طرح کی ڈھیروں تبدیلیاں اس کے اندر رونما ہوتی رہتی ہیں جو اس کردار کے ارتقائی سفر کی دلیل ہیں اور یہ ثابت کرتی ہیں کہ یہ کردار جامد نہیں۔ کچھ ایسے بھی کردار ہیں جو وقت کے ساتھ تبدیل تو نہیں ہوتے مگر اپنی خصوصیات کے ساتھ پوری کہانی میں اپنی موجودگی کا ثبوت دیتے ہیں جیسے 'موریشور کا کا' کا کردار جو اپنی خباثت کے ساتھ آخری حد تک چلا جاتا ہے اور ممبئی کا ہوائی سفر صرف اس لیے کرتا ہے تاکہ وہ متاشا کا ماضی سامنے لاکر اس کے بسے بسائے گھر کو برباد کرسکے۔ متاشا کی ماں کا کردار بھی اپیل کرتا ہے، وہ شروع ہی سے سخت جان تھی، اس کے والد کی ڈانٹ، جھڑکی، غصہ اور مار پیٹ کا شکار ہوتی مگر اُف نہ کرتی، شوہر کی اطاعت اور ساس کی خدمت کو اپنا وطیرہ جانتی، تین سال کی عمر سے ہی بیٹی پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کردیں، ضرورتاً پٹائی بھی کرتی مگر پربھاکر والے معاملے میں جب شوہر کے ظلم اور بیٹی کی مظلومیت کا اندازہ ہوا اور بھرت جیسے بے جوڑ شخص سے جب شادی کی بات آئی تو متاشا کی مرضی کے خلاف جانے سے انکار کردیا اور نتیجتاً ساس اور بچوں سمیت گھر چھوڑنے پر مجبور ہوگئی، وہیں سے اس کا رشتہ متاشا کے ساتھ سہیلیوں جیسا ہوگیا اور آخر آخر تک اس نے متاشا کا ساتھ نبھایا۔ متاشا کے باپ کا بھی رویہ عجیب تھا، بیٹی سے نفرت کی تو اس قدر کہ ساری زندگی اس کے خلاف رہا اور اس پر طرح طرح کی الزام تراشیاں کیں، یہاں تک کہ جان بوجھ کر ایسے حالات پیدا کیے کہ وہ موریشور کی ہوس کا شکار ہوگئی، پربھاکر کو بھی اس سے بدظن کردیا اور مرنے سے پہلے جب اپنی غلطی کا احساس ہوا تو بیٹی کے آگے ہاتھ جوڑ لیے۔ غرض کرداروں کی اس بھیڑ میں بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے کردار کی نفسیات پر بھی مصنفہ کی گہری نگاہ ہے، دادی جیسی مادر مہربان کی محبت اور خودداری کے مختلف رنگ، یوراج، پربھاکر، منجیت اور سمیر وغیرہ کے عشق کی نیرنگیاں، زندگی کے مشکل ترین دور میں متاشا کے ساتھ اس کے بھائیوں کی مشترکہ جدوجہد، نوکری کی تلاش، رشتہ داروں کی بے حسی، شادی کے بعد بھائیوں کے مزاج میں تبدیلی، بھابھیوں کے بدلتے رویے، کم عمری میں سوتیلے بچوں کا متاشا کے لیے پیار اور احترام مگر باپ کی موت کے بعد ان کا ظالمانہ سلوک بطور خاص بڑے بیٹے انکت کی مار پیٹ، گوتم اور بے بی جیسے کردار، بیٹے دیپو اور اس کے دوستوں میں آستا اور نونیتا کا کردار، پھوپھا جی اور رونق، اروی اور بلبل، بھرت اور سوریہ کا کا یہاں تک کہ اسٹیشن کے لاکر میں سامان رکھوانے والی آیا اور بیلن سے شوہر کو پیٹتی وہ دیدی بھی اپنا اپنا تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہیں۔ ان سارے کرداروں کی نفسیات پر گہری نگاہ رکھتے ہوئے مصنفہ نیا نہیں خلق کیا ہے اور تمام ہی کردار جگہ اور ماحول کے حساب سے بالکل فٹ اور پرفیکٹ ہیں۔ افتخار امام صدیقی کے مطابق:

> ''کسی بھی ناول میں بہت سارے کردار ہوں تو ان کی پوری نفسیات کو شروع سے آخر تک برقرار رکھنا پڑتا ہے اور یہ آسان کام نہیں۔''

(بحوالہ 'کہانیوں سے بنا ناول' مشمولہ کتاب 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' ص:11)

اس کے علاوہ یہ رائے بھی دیکھیں:

> ''پورے ناول کی فضا میں بہت ساری سانسیں جی رہی ہیں اور ہر ایک کی اپنی کہانی ہے۔'' (ایضاً)

غرض ان سارے کرداروں کی زندگی کے نشیب وفراز بیان کرنے کے لیے مصنفہ نے خود بھی ان کی زندگیوں کو جیا ہے، اپنے کاندھے پر ان کا سر لٹا کر سوچا ہے، اپنے سینے میں ان کا دل رکھ کر محسوس کیا ہے تب جاکر ان کی نفسیاتی گرہیں کھل پائی ہیں اور یہ کردار ہمیں زندہ جاوید اپنے آس پاس چلتے پھرتے نظر آسکے ہیں۔ کرداروں کی نفسیات اور ان کی ذات کے اظہار کے لیے مکالمے بھی بڑی ہی چابک دستی سے استعمال کیے گئے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ مصنفہ کو مختلف علاقوں کی زبان اور ان کے روزمرّہ سے گہری واقفیت ہے، مثال کے طور پر بمبئی سینٹرل اسٹیشن پر جب ویٹنگ روم کی آیا سے متاشا وہاں پیسے دے کر رکنے کی بات کرتی ہے تو وہ کیا کہتی ہے دیکھیں:

> ''چلے گا۔ اس نے کہا''
> ''سامان کہاں رکھوں؟''
> ''لفٹ لاکیج میں رکھنے کا۔ ایک دن کا ایک روپیہ لگتا ہے۔''
> ''یہ چلے گا۔''
> ''اور لفٹ لاکیج میں رکھنے کا''

یہ بمبئی کی عام لوگوں کی زبان ہے اور اسے عام طور پر وہاں کم پڑھے لکھے لوگ بولتے ہیں کیونکہ اسی طرح باندرہ کی وہ عورت بھی جب اپنے شوہر کو مارتی ہے تو متاشا کے سوال کے جواب میں کچھ اس طرح کے جملے ادا

کرتی ہے: ''آدمی کو ایسے ہی سدھارنے کا'' مطلب آدمی کو ایسے ہی سدھارا جاتا ہے۔

علی گڑھ کی خالص اردو زبان اور وہاں کی تہذیب سے کون واقف نہیں جب متاشا اپنے کلیگ میڈم صدیقی سے ملنے ان کے گھر جاتی ہے اور ان کی تین سال کی بچی اپنے ہاتھوں کو پیشانی تک لے جا کر جب یہ کہتی ہے:

''آداب، آیئے تشریف رکھیے، ٹھنڈا لیں گی یا گرم''
تو متاشا حیران رہ جاتی ہے اور مسٹر صدیقی کو جب متاشا 'صدیکی صاحب، آداب'' کہتی ہے تو وہ کہتے ہیں 'محترمہ متاشہ صاحبہ! صدیکی مت بولیے۔ حلق سے بولیے... بولیے قاف''اسی طرح کولم میں آشو کے ماما کی زبان سے ادا کیے گئے ان جملوں میں وہاں کا مقامی رنگ کیسے جھلکتا ہے دیکھیں۔''
''اور دندا (دھندا) کرنا ہے تو بورڈ ملیالم میں بنانا۔ دوسری باشا (بھاشا) میں لگائے تو توڑ کے پھینکتے سو۔''

غرض اس ناول میں مصنفہ نے کم وبیش جن جن علاقوں کا تذکرہ کیا ہے، وہاں کی زبانوں پر بھی بطور خاص نگاہ رکھی ہے اور اس پر بھی کہ ان مکالموں کی ادائیگی کا پس منظر کیا ہے؟ مکالمہ کب، کہاں اور کس کی زبان سے ادا ہو رہا ہے؟ زماں اور مکاں کا بھی خاص خیال رکھا ہے۔ ناول میں بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں کے واقعات وحالات کی منظر کشی کی گئی ہے اور اسی زمانے کے اعتبار سے مختلف علاقوں کے رسم ورواج، تہذیب وتمدن، زبان وبیان اور رہن سہن پر بھی خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ جزئیات نگاری میں تو مصنفہ کو ملکہ حاصل ہے، اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے رہن سہن، پہناوا اور مزاج کے ساتھ ان کی پوجا پاٹ کے طریقے، ویشنوی سماج کی رسمیں، ان کے طور طریقے، ان کے حالات، عیسائیوں کی تعلیمات اور ان کی عبادتوں کے طریقے اور رسم ورواج کی اس طرح سے تصور کشی کی ہے کہ سارا منظر نگاہوں کے سامنے تو پھرتا ہی ہے، مصنفہ کی معلومات پر بھی ذہن عش عش کر اٹھتا ہے۔ مثال کے طور پر لوہانہ ویشنوی سماج میں گوتم کی موت کے ساتویں اور تیرہویں دن ہونے والے کاموں کی تفصیلات دیکھیں:

''ساتویں دن ناسک میں گوتم کا پنڈ دان ہوا۔ تیرہویں دن گھر پر بھی برہمنوں کو کھلایا گیا۔ یہاں بھی ساتویں دن ہی کی طرح پانچ کلو چاول، گیہوں، ایک ایک کلو دالیں وغیرہ تیل، گھی، میدہ، روا، آلو، ایک گاؤں جوتے چپل، لالٹین، لاٹھی، پی نٹ، شرٹ، لنگی، کرتا، گدا، سونے کا سواستک اور انگوٹھی، لاکیٹ، سورگ میں جائیں، اس لیے چاندی کی سیڑھی جس میں سات پائیدان تھے، یہ سب چیزیں برہمن مردوں اور عورتوں کو دان میں دی گئیں۔''

(بحوالہ کہانی کوئی سناؤ متاشا، ص:271)

غرض مصنفہ نے بڑی عرق ریزی اور ایمانداری کے ساتھ مختلف مقامات اور سیاسی، سماجی، معاشی وجغرافیائی حالات اور انسانی نفسیات سے خاطر خواہ واقفیت کے بعد ہی اس ناول کی تخلیق کی ہے، ان کے اسلوب میں بے ساختگی اور دل پذیری ہے، چھوٹے چھوٹے جملے اور عام مکالمے ناول کی دلچسپی کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں۔ اس پورے ناول میں مصنفہ کا نقطۂ نظر بھی بالکل واضح اور صاف وشفاف ہے کئی مقامات پر بطور خاص مرکزی کردار متاشا کی زبان سے ادا ہونے والے جملوں سے بھی نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ اس ناول کی تانیثی حیثیت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے۔ پورا ناول عورت کی مظلومیت کی داستان ہے لیکن کہیں بھی زندگی سے فرار نہیں ہے۔ پیدائش سے بچپن، لڑکپن، جوانی اور عمر کی پختگی تک ہر پل استحصال کا شکار ہوتی متاشا کو مرد ذات سے نفرت ہوگئی ہے مگر اسے 'ممی اور بھائیوں کے لیے جینا تھا۔

آگے چل کر اسے اپنے شوہر، سوتیلے بچوں اور اپنے بیٹے کے لیے جینا پڑا اور آخر میں دیپو کی ہونے والی اولاد کی پرورش کے لیے اس نے جینے کا فیصلہ کیا، ستم ظریفی حالات نے اسے پل پل مارا مگر اس نے ہار نہیں مانی اور یہی کہتی رہی: ''ہار کے نہیں جاؤں گی، میں جاؤں گی مگر ہاروں گی نہیں'' (بحوالہ 'کہانی کوئی سناؤ متاشا'، ص:88) یہ اور اس طرح کے ڈھیروں پیغام ناول کے بطون میں موجود ہیں جو بدترین حالات میں بھی زندگی جینے کا حوصلہ اور سلیقہ دیتے ہیں، انسانیت کی خدمت کا سبق پڑھاتے ہیں اور امید کی شمع روشن رکھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ بلاشبہ ناول نگاری کی تمام تر خصوصیات سے مزّین یہ ایک کامیاب ناول ہے جسے ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نے بڑی ہی کامیابی سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔

❑❑❑

Dr. (Mrs.) Sabera Khatoon Hina
Assistant Prof.
T.D.B College
Raniganj
Paschim Bardwan713347 (W.B)

ڈاکٹر نزہت پروین

تبسم فاطمہ کے افسانوں میں احتجاج

تبسم فاطمہ کی پیدائش 3رجولائی 1967 میں آرا (بہار) میں ہوئی ۔ابتدائی تعلیم آرا میں حاصل کی ۔بی ۔اے کی ڈگری آرا سے ہی حاصل کی اور نفسیات میں ایم ۔اے کیا۔ انھوں نے 1984 سے لکھنا شروع کیا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''لیکن جزیرہ نہیں'' 1995 میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ ''تاروں کی آخری منزل'' 2012 میں شائع ہوا۔ ان دو مجموعوں سے تیرہ افسانے نکال کر ''سیاہ لباس'' کے نام سے ایک مجموعہ 2014 میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ہندی میں ایک درجن سے زائد کتابوں کے ترجمے کر چکی ہیں۔

تبسم فاطمہ کی شادی مشہور فکشن نگار مشرف عالم ذوقی سے ہوئی اور دونوں نے الیکٹرونک میڈیا سے جڑ کر سینکڑوں کی تعداد میں سیریل، Short film اور ڈیکومینٹری فلمیں بنائیں ۔الیکٹرونک میڈیا میں دونوں کا نام کافی جانا پہچانا تھا دونوں نے ایک بڑے بجٹ کا ڈیلی سوپ ''جوالامکھی'' کا آغاز کیا تھا لیکن فائنسر نہ ملنے کی وجہ سے شروع نہیں ہوسکا۔ بہرحال تبسم فاطمہ نے ادب سے کبھی اپنا رشتہ منقطع نہیں کیا۔ وہ پڑھتی زیادہ تھیں اور لکھتی کم تھیں ۔کم لکھنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اکثر سوچتیں کہ کیا لکھوں کہ میری الگ شناخت قائم ہو۔ وہ لکھتی ہیں:

> ''میں نے اچھی کہانیاں تو نہیں لکھیں لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ اپنے آس پاس کے ہونے والے واقعات سے میں نے کبھی آنکھیں بند نہیں رکھیں ۔ واقعات، حادثات اور سماج میں اٹھنے بیٹھنے والے کردار کب کیسے میری کہانی کے کردار بن گئے کہہ نہیں سکتی۔'' (لیکن جزیرہ نہیں، صفحہ 9)

تبسم فاطمہ نے اچھی کہانیاں لکھیں یا نہیں یہ تو فیصلہ وقت کرے گا لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے سماج میں ہونے والی زیادتیوں اور ناانصافیوں کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا۔ وہ عورت کو کمزور یا بزدل نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ عورتیں آنسو نہ بہائیں بلکہ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کریں اور احتجاج کریں ۔اس لیے وہ کہتی ہیں کہ ''میں بالکل نہیں مانتی کہ عورت بہت کمزور اور مجبور ہے ۔وہ ستائی ہوئی ہو سکتی ہے مگر ہاری ہوئی نہیں۔''

تبسم فاطمہ زندگی میں کبھی ہار نہیں مانی ۔مشرف عالم ذوقی صرف قلم لے کر دلی آئے تھے اور چند سال کے بعد ہی ان کی تبسم فاطمہ سے شادی ہوگئی لیکن تبسم فاطمہ نے ذوقی کا ہر حال میں نہ صرف ساتھ دیا بلکہ حالات سے لڑنا سکھایا۔ ذوقی لکھتے ہیں- ''بیشک میں زندگی میں کئی مقام پر ہارا۔ کئی مقام ایسے بھی آئے جب ہارتے ہارتے بچا ہوں اور ایسے ہر مقام پر سوچتا ہوں تبسم کا ساتھ نہ ملا ہوتا تو شاید کمرے کی ویرانی اور اپنے اندر کی خاموشی سے سمجھوتہ کر چکا ہوتا۔''

جس عورت نے اپنے شوہر کے حوصلے اور ہمت کو کبھی پست نہیں ہونے دیا وہ یقیناً ذہنی طور پر کتنی توانا ہوگی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تبسم فاطمہ عملی طور پر بھی بولڈ تھیں اور اپنے افسانوں میں بھی اپنی بولڈنس کا ثبوت فراہم کرتی ہیں ۔افسانہ ''صحرا میں نہیں رہنا'' کی عورت وہی سب سوچتی ہے جو تبسم فاطمہ سوچتی ہیں۔

"یہ کیسی آزادی ہے کہ ساری زندگی ایک چہار دیواری کے اندر ایک ایسے آدمی کے ساتھ بسر کی جائے جس سے نہ خیال ملتے ہوں ۔ نہ معیار اور وہ ہر وقت ساتھ میں پنجرہ لیے گھومتا رہتا ہو......زیادہ اُڑان مت بھرو پنجرے میں آجاؤ۔ یہ ٹی۔ وی دیکھنے کا وقت نہیں ہے۔ میرے دوست آنے والے ہیں چلو پنجرہ سنبھالو۔ تم جاب کرو گی؟ نہیں تم پنجرے میں زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہو۔"

(افسانہ صحرا میں نہیں رہنا، ادب سلسلہ، صفحہ 200)

ان چند جملوں میں تبسم فاطمہ نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو آج کی عورت کا درد ہے۔ ایک لڑکی اپنا سب کچھ چھوڑ کر ایک اجنبی گھر، اجنبی لوگوں کے درمیان شادی کے بعد آتی ہے اور اسے سسرال میں آکر کیا ملتا ہے۔ شوہر سے خیال ملتے ہوں یا نہ ہوں۔ اس کے معیار پر پورا اترتا ہو یا نہ ہو لیکن اس کے ساتھ زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ نہ عورت کے جذبات کی اسے فکر ہوتی ہے نہ اس کے خیالات کی۔ وہ عورت کو زر خرید غلام سمجھتا ہے اور ہر وقت ایک پنجرہ لے کر گھومتا رہتا ہے۔ ذرا سا بھی اُڑنے کی کوشش کرتی ہے شوہر پنجرہ لے کر سامنے آجاتا ہے۔ اگر عورت جاب کرنا چاہے تو اسے نہیں کرنے دیا جاتا۔ گھر والوں کی خدمت کون کرے گا۔ کھانا کون بنا کر دے گا۔ سب کا خیال کون رکھے گا۔ عورت سب کا خیال رکھے مگر اس کا خیال کوئی نہیں رکھتا۔ وہ کولہو کے بیل کی طرح جتی رہتی ہے۔ وہ اپنی مرضی سے کوئی کام نہیں کر سکتی۔ آگے کی تعلیم جاری رکھنے کے لئے شوہر اور ساس سسر کی اجازت لینی ضروری ہے۔ نوکری کرنے کے لیے سسرال والوں کی رضامندی ضروری ہے، گھر سے کہیں باہر جانا ہے تو بغیر اجازت کے نہیں جا سکتی۔ کتنی عورتیں ہیں جو اپنی مرضی سے زندگی جیتی ہیں اور اگر احتجاج کیا تو پھر گھر کا دروازہ کھلا ہے۔ جا سکتی ہو، لیکن اس افسانہ کی راوی آزاد زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ جب اس کی شادی طے ہونے لگی تو اس نے کہا۔

"جہاں مرضی کر دیجیے۔ وہ میرے ساتھ جی سکے گا تو یہ اس کی خوش نصیبی ہوگی۔ اماں میرے ان تیوروں سے واقف تھیں۔ وہ اکثر میری باتوں پر خاموش رہنا ہی پسند کرتی تھیں۔ ویسے بھی وہ خاموش طبیعت واقع ہوئی تھیں۔ میں ایک این۔ جی۔ او سے وابستہ تھی اور کاشف بینک میں اعلیٰ عہدے پر تھے۔ کچھ ہی دن میں وہ میرے مزاج سے واقف ہو گئے جبکہ شروعات میں انہوں نے دباؤ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن جلد ہی کاشف کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ یہ لڑکی ٹیڑھی کھیر ہے اور بہتر ہے کہ بھڑ کے چھتے میں ہاتھ نہ ڈالا جائے۔"

(افسانہ "صحرا میں نہیں رہنا" ادب سلسلہ صفحہ 202)

یہ افسانہ ایک باغی لڑکی کا افسانہ ہے جو اپنے طور پر زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ وہ اپنی آزادی کے لیے کبھی ہارمونیم بجاتی، کبھی کتابوں کا سہارا لیتی جبکہ اس کا شوہر نہ رومانی تھا نہ اسے موسیقی پسند تھی لیکن کاشف کے اندر ایک تبدیلی آتی ہے وہ اس کے ہارمونیم بجانے پر ایک دن کہتا ہے "تم واقعی ہارمونیم اچھا بجا لیتی ہو۔" پھر وہ کتاب اٹھا کر پوچھتا ہے۔ یہ تو قرۃ العین حیدر کا ناول "چاندنی بیگم" ہے۔ میں نے ان کا نام سنا ہے۔ ممکن ہے کاشف میں یہ تبدیلی اس ڈر کی وجہ سے ہو جو اپنی بیوی کی آزادی سے گھبرا کر اس کا ساتھ دے رہا ہوں۔

تبسم فاطمہ عورت کو اسی روپ میں دیکھنا چاہتی ہیں لیکن افسانہ "سیاہ لباس" کی ماں آزاد خیال ہوتے ہوئے بھی جوان ہوتی بیٹی کے لیے فکر مند ہے۔ بیٹی جس طرح روز ہونے والے واقعات وحادثات کو ماں سے شیئر کرتی ہے ماں ڈر جاتی ہے لیکن بیٹی نظر انداز کر دیتی ہے کہ نئے زمانے میں یہ تو روز کا معمول ہے لیکن جب کالج کا بوڑھا پروفیسر راستے میں اور بوڑھے لوگ کی نگاہیں اسے اپنے جسم میں اندر تک چبھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں تو وہ کہتی ہے۔

"نہیں ....صحیفہ زور سے چیخی۔ لڑکوں سے ڈر نہیں لگتا بوڑھوں سے ڈر لگتا ہے ...... وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہی تھی ......سڑک پر باتیں کرتے ہوئے شاپنگ کرتے ہوئے کہیں بھی چلے جاؤ ...... بوڑھی نظریں ایسے گھور رہی ہوتی ہیں جیسے کبھی لڑکی دیکھی ہی نہ ہو............ جیسے یہ نظریں جوان گوشت میں سما جائیں .... کیوں ہو گئے ہیں سب لوگ ایسے۔ کیوں سمجھتے ہیں کہ لڑکیاں محض گوشت کی دکان ہیں ان کے لیے۔ صحیفہ زور سے چیخی ....وہ کالج کا بڈھا پروفیسر......میں اسے کئی دنوں سے دیکھ رہی ہوں ......مگر اب ......صحیفہ کی سانسیں الجھ گئی تھیں ....گھر سے باہر نکلو تو جیسے جسم پر ہزار چبھتی ہوئی آنکھیں ہوتی ہیں۔"

(افسانہ سیاہ لباس صفحہ 15)

اور صحیفہ ایک الگ فیصلہ لیتی ہے۔ نہ وہ کالج چھوڑتی ہے نہ راستے پر چلنا بلکہ اپنے لیے ایک نقاب خریدتی ہے اور اب وہ نقاب لگا کر باہر نکلتی ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا نقاب لگانا مسئلے کا حل ہے۔ صحیفہ اس لیے نقاب پہن کر نکلتی ہے چونکہ وہ مسلمان ہے لیکن ہندو لڑکیاں کیا کریں گی۔ یہاں مردوں کی سوچ اور نظریہ پر حملہ ہے۔ راہ چلتی یا کالج جاتی لڑکیوں کو اس طرح گھورنا ایک عام بات ہے لیکن اس سوچ میں کب تبدیلی آئے گی اپنی نظروں سے لڑکیوں کے جسم کو چھیدنے والے شخص یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ان کی بہو بیٹیاں بھی تو باہر نکلتی ہیں اور اس کے جسم کو بھی تو کوئی اپنی نظروں سے چھید تا ہوگا۔ تبسم فاطمہ مردوں کو اپنی سوچ بدلنے کے لیے پرزور اپیل کرتی ہیں تا کہ کسی لڑکی کو نقاب لگا کر گھر سے نکلنے کی ضرورت نہ ہو۔

افسانہ ''حجاب'' میں چودہ سال کے ایک بیٹے کو ماں کے نیٹ پر چیٹ کرنے سے اعتراض ہے۔

''کیا کر رہی تھی اماں۔؟''

یکا یک اس کے سوال سے چونک پڑی میں...... ''کچھ نہیں۔''

''چیٹ کر رہی تھی؟''

''ہاں کہتے ہوئے اس کی طرف مڑی .... اماں چیٹ نہیں کر سکتی کیا؟''

''کیوں نہیں......کوئی دوست؟''

''اماں کے چیٹ فرینڈ نہیں ہو سکتے کیا؟''

''کیوں نہیں......''

ایک ماں بیٹے کے درمیان یہ مکالمہ بیٹے کی ذہنیت کو واضح کرتا ہے۔ ماں جو وقت گزاری کے لیے نیٹ سے جڑی ہے لیکن بیٹے کو یہ قطعی پسند نہیں کہ ماں کے فرینڈ ہوں اور وہ چیٹ کرے۔ جبکہ اس کے شوہر کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

''حجاب'' ایک باغی عورت کا افسانہ ہے جب وہ بڑی ہو رہی تھی اور ماں اسے حجاب پہننے کے لیے کہتی ہے تو وہ صاف منع کر دیتی ہے کہ وہ حجاب نہیں پہنے گی زرینہ بچپن میں گلی میں بچوں کے ساتھ کنچے کھیلتی تھی...... کبڈی کھیلتی تھی۔ بندر کا تماشہ دیکھتی تھی لیکن اس کے جوان ہوتے ہی تمام چیزوں پر پابندی لگا دی گئی۔ لیکن اس کا سوال اپنی جگہ قائم تھا کہ بھائیوں کو ساری آزادی اور مجھے قید کیوں .... وہ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔ جس سے چاہیں مل سکتے ہیں۔ میں ایسا کیوں نہیں کر سکتی اسے کیوں حجاب پہنانے کے لیے گھر کے لوگ بضد ہیں۔ اور زرینہ بغاوت کرتی ہے۔ پھر اس کی شادی ہو جاتی ہے اور اس کا بیٹا عظمی دھیرے دھیرے پروان چڑھتا ہے اور آج چودہ سال کا بیٹا ماں سے چیٹ کرنے پر سوال کرتا ہے۔

دراصل عظمی بیٹا کی شکل میں مردانہ سماج کا نمائندہ بن جاتا ہے۔ زرینہ کے والد کل جو چھوٹی بڑی باتوں پر اسے ٹوکتے رہتے تھے آج زرینہ کا بیٹا ماں کے چیٹ کرنے پر سوال کر رہا ہے۔ یعنی زمانہ اتنی ترقی کرنے کے بعد بھی عورت کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی روپ میں مردانہ سماج کے بندھن سے نہیں نکل سکی ہے۔ بغاوت کرنے والی زرینہ آج ایک بار پھر اسی سوال کے گھیرے میں ہے۔

''میں واپس اس جگہ کو دیکھتی ہوں جہاں کچھ دیر پہلے عظمی موجود تھا۔ اب وہاں کوئی نہیں ہے ...... لیکن اس کے لفظ مجھے ڈرا رہے ہیں ......اندر ایک ہلچل سی ہے۔ سائن آؤٹ کرتی ہوئی میں خاموشی سے ٹھہر جاتی ہوں۔ ایسا لگا جیسے برسوں بعد ایک بار پھر میرے بیٹے نے مجھے حجاب پہنا دیا ہو۔''

عورت چاہے جتنی بھی ترقی پسند ہو کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی روپ میں اس کے وجود پر حملہ ہوتا رہتا ہے۔ کبھی باپ......کبھی شوہر......اور کبھی بیٹا......یعنی عورت گھوم پھر کر اسی محور پر رقص کرتی رہتی ہے جیسا صدیوں سے کرتی رہی ہے۔

افسانہ ''جرم'' میں ایک شوہر اور بیوی کی کہانی ہے۔ منیش اور دیپا نے محبت کی شادی کی ہے۔ منیش دبو قسم کا شخص ہے جبکہ دیپا بے حد بولڈ۔ رات کے وقت دیپا کے اندر ایک ایسی عورت ابھر کر سامنے آتی ہے جو اپنے طور پر رات گزارنا چاہتی ہے لیکن منیش دوسرے مردوں کی طرح اسے ٹریٹ کرتا ہے جو دیپا کو پسند نہیں ہے۔

تبسم فاطمہ کی عورت سراپا احتجاج ہے۔ کبھی یہ عورت اپنے باپ سے احتجاج کرتی ہے۔ کبھی اپنے شوہر سے۔ کبھی سماج سے اور کبھی اپنے بیٹے سے۔ تبسم فاطمہ کی عورت روز مرد سماج سے ٹکراتی ہے اور انقلاب کا جھنڈا بلند کرتی ہے۔ یہ لڑائی اکیلے تبسم فاطمہ کی نہیں ہے ہر خواتین افسانہ نگار کی ہے لیکن تبسم فاطمہ جیسی جرأت کتنی خواتین افسانہ نگاروں میں ہے۔ اس لیے تبسم فاطمہ دوسری خواتین افسانہ نگاروں سے الگ نظر آتی ہیں۔

□□□

Dr. Nuzhat Parween
Hanif Manzil
Koyli Pokhar, Police Line
Gewal Bigha
Gaya-823001 (Bihar)
Mob. 8084808032

ڈاکٹر عائشہ فرحین

سلمیٰ صنم کی افسانہ نگاری

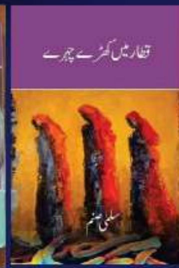

اردو فکشن میں سلمیٰ صنم صاحبہ کا نام محتاج تعارف نہیں۔ ریاست کرناٹک کے شہر بنگلور سے تعلق رکھنے والی سلمیٰ صنم صاحبہ پیشہ سے لکچرر ہیں۔ جوار دو ادب میں بحیثیت افسانہ نگار اپنے قلم کے جوہر دکھاتے ہوئے اہم شناخت بنا چکی ہیں۔ موصوفہ فخر کرناٹک ہی نہیں فخر اردو فکشن ہیں۔ ان کے فن و شخصیت پر نہ صرف ملک کے مختلف جامعات میں تحقیقی کام ہو چکے ہیں بلکہ پاکستان کی جامعات میں بھی ان کے افسانوی فن پر تحقیقی مقالات لکھے جا چکے ہیں۔

ان کے افسانوں کا منفرد اسلوب اور موضوعات کا تنوع انھیں معاصرین میں منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ انھوں نے زندگی کے تقریباً ہر شعبہ سے متعلق متنوع موضوعات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ ان کے افسانے بے شک تانیثی نظریات سے مملو نہیں، لیکن بیشتر افسانوں کا موضوع عورت ہی ہے۔ لیکن ان کے یہاں عورت اپنے مختلف روپ اور رویوں کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ یہ وہ عورت نہیں جو صدیوں پرانی روایتوں میں جکڑی، سمٹی ہوئی، بے بس و مجبور ہے، بلکہ یہ دور جدید کی باہمت، بااعتماد عورت ہے۔ یہ وہ عورت نہیں جو رسم و رواجوں، اندھے عقائد، مذہب، غیرت اور عزت کے نام پر اپنی ہستی کو مٹا دے بلکہ یہ جدید دور کی جدید حقائق سے آگاہی رکھنے والی، اپنی ہستی میں ڈوب کر سراغ پانے والی، مرداساس معاشرے میں اپنے وجود کو منوانے والی، ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والی، احتجاج کرنے والی بے باک، نڈر اور حوصلہ مند عورت ہے۔ جسے یہ احساس ہے کہ وہ بھی انسان ہے اور اسے بھی جینے کا اتنا ہی حق ہے جتنا ایک مرد کو ہے۔

سلمیٰ صنم کے افسانوں کی ایک خوبی ان کے سادہ سلیس خوبصورت تشبیہات سے آراستہ زبان ہے جس میں ان کے منفرد بیانیہ نے چار چاند لگا دیے ہیں۔ ان کے افسانوں کا آغاز قارئین کو متوجہ کرنے والا تو انجام قاری کے ذہن میں سوچ کے نئے در وا کرتا ہے۔

سلمیٰ صنم صاحبہ کے تین افسانوی مجموعے ''طور پر گیا ہوا شخص''، ''پت جھڑ کے لوگ'' اور ''پانچویں سمت'' منظر عام پر آ کر قارئین سے داد و تحسین وصول کر چکے ہیں۔ پیش نظر ان کا افسانوی مجموعہ ''قطار میں کھڑے چہرے اور دیگر کہانیاں'' میں شامل افسانوں کا فنی و موضوعاتی تجزیہ ہے۔ بیس افسانوں پر مشتمل اس مجموعہ کو موصوفہ نے اپنے والدین سے منسوب کیا ہے جس پر اردو فکشن کی مایہ ناز ہستی محترم نور الحسنین صاحب نے پسندیدگی کی سند اپنے مضمون ''نئی فکر نئی اڑان'' میں عطا کر دی ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر شوکت محمود شوکت اور شہاب ظفر اعظمی صاحبان نے زیر مطالعہ کتاب میں شامل افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے، سلمیٰ صنم صاحبہ کے فن پر مختلف حوالوں سے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ کتاب کے بیک کور پر ماہرین فکشن کے توصیفی کلمات نے سلمیٰ صنم صاحبہ کے فن کی اہمیت و افادیت کو مزید روشن کیا ہے۔ ان ماہرین میں قمر رئیس۔ دہلی، شموئل احمد۔ بہار، نسیم انجم۔ کراچی اور ناصر ناکاگوا۔ جاپان شامل ہیں۔

سلمیٰ صنم صاحبہ کے افسانے عصر حاضر کے مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ جس میں انسانی رشتوں کی بے حرمتی، تقدس کی پامالی، باشعور شہری کی تڑپ، عورتوں کی وفا شعاری اور بے بسی سے باہمتی کے سفر کی داستان منفرد پیرائے میں رقم کی گئی ہے۔

عورت کی باہمتی کا سفر افسانے ''آرگن بازار''، ''کٹھ پتلی''، ''پانچویں سمت'' میں واضح نظر آتا ہے۔ایک عرصے تک صبر وشکر کرنے کے بعد بھی مرد کی بے وفائی، مفاد پرستی اور زور زبردستی سے تنگ آکر ''آرگن بازار'' کی ثمین ''پانچویں سمت'' کی رجنی اور ''کٹھ پتلی'' کی آسیہ ایک نئے جوش وجذبے سے اپنے وجود کو منواتی ہیں۔

ثمین، امیر کو اپنا گردہ دینے کے باوجود اس سے شادی سے انکار کردیتی ہے۔یہ انکار امیر کی مطلب پرستی، جہیز کے نام پر ثمین کے جسم کا حصہ خریدے جانے کے خلاف پرزور احتجاج کی صورت سامنے آیا ہے۔وہ امیر کو دھتکار کر اپنے وجود کی اہمیت جتاتی ہے کہ وہ اتنی بے ضرر نہیں کہ شادی کے لیے اپنے جسم کا ایک عضو بیچ کر، عمر بھر اسی خود غرض مرد کی غلامی کرے، امیر جسے اپنے پیسوں پر زعم تھا، جس کے نزدیک ثمن کی حیثیت مخمل میں لگے ٹاٹ کے پیوند جیسی تھی۔لیکن بدلے حالات نے امیر کو اسی ٹاٹ کے پیوند کو مستقل اپنے جسم کا حصہ بنانے پر مجبور کردیا تھا۔خدا نے اسی مفلس منگیتر کو اس کی جان بچانے والی بنادیا۔ثمن اپنے ہتک اور بے عزتی کا بدلہ امیر کو ریجیکٹ کرکے لیتی ہے۔''آرگن بازار'' افسانہ جہیز جیسی لعنت پر کڑا طنز تو ہے ہی لیکن ساتھ ہی انسانی رشتوں کا المیہ، غریبوں کی لاچاری و بے بسی، امیروں کی سفاکی کا بھی عکاس ہے۔

افسانہ دورِ جدید کے مادیت پرست انسانوں کے چہروں پر چڑھے رشتوں کی قلعی کھول دیتا ہے۔افسانہ نگار نے ایک روایتی موضوع میں سائنسی ترقی، عضو کی پیوند کاری کے عمل کو شامل کرتے ہوئے جدت پیدا کردی ہے۔ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا، جس میں باضابطہ ''آرگن بازار'' قائم ہوجائیں گے۔لوگ اپنی دولت کے بل بوتے پر اپنا من پسند عضو بہ آسانی خرید لیں گے پھر چاہے اس بازار میں کتنے ہی دلہنوں کے ارمان جل کر خاک کیوں نہ ہوجائیں لیکن کاروبار چلتا رہے گا۔افسانے کے یہ جملے ثمن کی ذہنی کیفیت کے عکاس ہیں۔

''وہاں تو بس آگ ہی آگ تھی۔شعلے دہکتے ہوئے، چنگاریاں سلگتی ہوئیں۔وہ بے معنی انداز میں شعلوں کو گھورنے لگی۔دفعتاً اسے لگا بھڑکتے شعلے کسی پیکر میں ڈھل رہے ہیں۔وہ ایک دلہن تھی سرخ جوڑے میں لپٹی جس کا ہیولیٰ انگاروں پر کانپ رہا تھا، مگر یہ کیا؟ ثمین کا ذہن بھک سے اڑ گیا۔دلہن تو انسانی اعضا سے سجی ہوئی تھی۔''

افسانہ امیروں کا انسانی اعضا کی پیوند کاری کے عمل کے ساتھ جہیز کے نام پر ایک لڑکی کے ارمانوں کے قتل کی داستان بھی بیان کررہا ہے۔افسانے کی خوبی اس کا غیر متوقع انجام ہے۔جو جہیز جیسی لعنت اور امیر جیسے مطلب پرست کے منہ پر زوردار طمانچہ ہے۔

سلمیٰ صنم کے افسانوں کی عورت وفا شعار، عجز و انکسار کا پیکر ہے۔لیکن جب مرد کی چالاکی، ظلم، مفاد پرستی بڑھ جائے، پانی سر سے اونچا ہوجائے، برداشت کے آخری حد پار کرجائے تو پھر وہ سیتا سے کالی کا روپ بھی دھارن کرنے میں دیر نہیں کرتی۔

افسانہ ''پانچویں سمت'' کی رجنی صدیوں سے چلی آرہی پرتھا ''نیوگ'' کے خلاف احتجاج کرتی ہے۔وہ اپنی ماں بننے کی خواہش کو قربان کرا کیسویں صدی کی باہمت عورت بن کر مہاراج کے سامنے ڈٹ جاتی ہے۔دور سے آتی بھجن کی آواز اسے اپنی اندر پوشیدہ پانچویں سمت کا پتہ دے جاتی ہے۔

افسانہ ''کٹھ پتلی'' سیدھی سادی زبان میں عورت کی کٹھ پتلی بننے کی داستان ہے۔جس میں آسیہ ایک ماں اور بیوی کے روپ میں وفا شعار، صبر وشکر کا پیکر بنی اپنی تمام ذمہ داریوں کو ''کٹھ پتلی'' کی طرح انجام دے رہی ہے۔آسیہ ایسی عورت ہے جو شوہر کے ہر حکم کے آگے سر تسلیم خم کرتی ہے۔یہاں تک کہ شوہر کے سیاسی کھیل کا ایک اہم مہرہ بنی تمام غلط کاموں کی معاون بھی بن جاتی ہے حالانکہ اس کے اندر کی عورت اسے ہمیشہ یہ احساس دلاتی ہے کہ:

''پندار کو ٹھیس لگتی ہے۔انا کا ناگ پھن پھیلائے کھڑا ہوجاتا تو کون ومکان میں ایک ہلچل سی مچ جاتی۔۔نہیں۔۔آسیہ نہیں۔''

لیکن ہر بار بزرگوں کی ہدایت، نصیحت کہ ''شوہر تو مجازی خدا ہے۔اس کے آگے عورت کی انا۔۔۔۔۔بے معنی ہے۔''

بس پھر آسیہ کی انا بھی اپنے آپ مرجاتی۔لیکن شوہر کی زیادتی اور بےوفائی پر آسیہ کا پراعتماد مزاحمتی عمل سامنے آتا ہے۔

''نہیں آسیہ نہیں۔۔تم اس puppet Show کی کٹھ پتلی نہیں۔''

یہ آج کی عورت کا وہ روپ ہے جسے اپنے وجود کی اہمیت کا احساس ہے۔یہ احساس اس کے اندر ایک نئی آواز، نئی امید اور نیا اعتماد پیدا کرتا ہے۔

اکیسویں صدی کی عورت کا یہ اعتماد ہمیں ''یخ لمحوں کا فیصلہ'' کی ثانیہ کے پاس بھی نظر آتا ہے جو اپنی کوکھ میں سانس لیتی چوتھی ننھی کلی کے لیے ڈھال بن جاتی ہے۔جسے اس کا باپ جدید ترین ٹکنالوجی کا سہارا لے کر قتل کرنا چاہتا تھا۔لیکن ثانیہ ایک ماں بن کر لمحوں میں فیصلہ کرلیتی ہے کہ:

''تم گھبراؤ مت۔شاید تمھارے ابو کو تمھاری وجہ سے جنت بدر کیے جانے کا خوف ہو لیکن میں تم سے خوفزدہ نہیں ہوں۔تم تو میری جان ہو۔میں تمام مخالفت کے باوجود تمھیں جنم دوں گی اور اس زمیں پر پروان

چڑھنے کا حق بھی۔۔۔اس کو لگا بچی نے خوشی سے ایک کلکاری ماری ہو۔ثانیہ کے چہرے پر ممتا کا نور پھیل گیا۔"

افسانہ "طور پر گیا ہوا شخص" دور حاضر کے تقریباً ہر گھر کی کہانی ہے جہاں لڑکیاں سالوں اپنے طور پر گئے شوہر کے منتظر سسرالی عزیزوں کی خدمت کرتی بوڑھی ہو جاتی ہیں۔یہ ہمارے معاشرے کا بہت اہم مسئلہ ہے کہ والدین اپنی بیٹیوں کے روشن مستقبل کے لیے دیارِ غیر میں ملازمت پیشہ لڑکوں سے شادی کو ترجیح دے رہے ہیں۔جو محض چند دن کی آسائش اور عمر بھر کی مسافت ثابت ہوتی ہے۔افسانے کا اقتباس دیکھیے:

"متوسط طبقے میں جانے یہ کیسی وبا پھیلی ہوئی تھی۔آسائشوں کی آگ لینے بے وطنی کے کوہ طور پر جانے والے لڑکوں سے اپنی لڑکیوں کو بیاہ کر انھیں دیارِ غیر دھکیلنے کی یا اپنی سرزمین پر انتظار کی تپتی ریت پر آبلہ پا بھٹکنے کی۔۔۔۔۔جو دیارِ غیر سے لدے پھدے آتے کتنی سحر آفریں ہوتی تھی ان کی شخصیت، جن میں ان کا وجود کم اور ان کی چیزیں زیادہ نمایاں نظر آتی تھیں۔"

سلمٰی صنم صاحبہ نے اس افسانے میں معاشرے میں پھیلی اس وبا کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے جو تیزی سے پھیل رہی ہے۔اس کو روکنا اور اس کے مضر اثرات سے آگاہ کرنا، بہت ضروری ہو گیا ہے۔والدین کی یہ سوچ کہ دیارِ غیر میں ملازمت کرتے لڑکے ہی ان کے بیٹیوں کا مستقبل سنوار سکتے ہیں لڑکیوں کو لامتناہی غم میں مبتلا کرنے کی وجہ بن رہی ہے۔والدین تو بیٹی کو بیاہ کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں، شوہر بھی اپنے اور اپنوں کے خواب پورے کرنے دیارِ غیر کی خاک چھاننے چلا جاتا ہے۔پیچھے رہ جاتی ہے تو لڑکی، جو کسی کی بیوی، بہو، بھابی ہے۔اس کی دل جوئی، وقت گزاری کے لیے سسرال کے نہ ختم ہونے والے کام اور طعنے جو اس کی روح و جسم کو ہر لمحہ زخمی کرتے ہیں لیکن ان رشتوں کی ڈور میں باندھنے والا اس کا ہمسفر، اس کے زخموں پر پیار و وفا کا مرہم رکھنے والا شوہر، میلوں دور ہوتا ہے۔

اس افسانے میں معاشرے کے اس رویے پر بھی طنز کیا گیا ہے جو عورت کو مادی آسائشیں دے کر، فطری خواہشوں اور ضرورتوں کو مارنے پر مجبور کرتے ہیں۔اس عمدہ افسانے میں افسانہ نگار نے شوہر سے دور تنہائی کا درد سہتی عورت کے احساسات کی ترجمانی کمال ہنرمندی سے کی ہے۔جس میں عورتوں کا فطری تقاضوں سے مجبور ہو کر کسی سامری کے جال میں پھنسنے کی طرف بھی اشارہ ہے۔پیش نظر اقتباس معنی خیز اور اہم ہے:

"وہ جو بے وطنی کے کوہ طور پر آگ لینے گیا تھا۔وہ پیغمبری لے کر ضرور لوٹتا مگر اس کے بیچ اگر کوئی سامری آ جائے تو پھر کیا ہو؟؟ زینت گھبرا کر سوچتی اور ہاتھ مل کر رہ جاتی۔"

گر واقعی کوئی عورت اپنی فطری جبلتوں سے مجبور ہو جائے اور کسی سامری کے جال میں پھنس جائے تو؟

یہ سوال بہت اہم ہے اگر ایسا ہو جائے تو پھر ہم اس کا قصوروار کس کو ٹھہرائیں گے۔دیارِ غیر کے امیر لوگوں کو جو انسانوں کو امپورٹ کرتے ہیں، یا والدین کو جو اپنی بیٹی کے شاندار مستقبل کی خام خیالی میں مگن ہیں، یا وہ جو اپنے بیٹوں کو صرف پیسہ چھاپنے کی مشین سمجھتے ہیں۔

افسانہ نگار نے کوہ طور، آگ، سامری، جیسی خوبصورت معنی خیز علامتوں کے سہارے معاشرے میں پنپ رہی ایک اہم برائی کو افسانوی پیرائے میں ڈھالا ہے۔افسانہ مختصر ہوتے ہوئے بھی وسیع مفاہیم کا احاطہ کرتا کامیاب ہے۔

انسان کو اپنی خودی کی پہچان کراتا افسانہ "تڑپتا پتھر" بھی مختصر لیکن موضوعی اور معنوی اعتبار سے بے حد اہمیت کا حامل ہے جس میں انسان کو خود شناسی کا درس دیا گیا ہے۔یہ حقیقت ہے کہ جب تک انسان اپنی "میں" کو نہ مار دے تب تک اسے دنیا اور دنیا کی حقیقت کا پتہ نہیں چلتا۔خود شناسی کے لیے "میں" کا خاتمہ ضروری ہے۔خود شناسی ہی خدا شناسی تک پہنچنے کے پہلی سیڑھی ہے۔

افسانے "قطار میں کھڑے چہرے" اور "بھیگے کاغذ میں لپٹے ہوئے لمحات" میں موذی بیماریوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس مرض کا شکار ہوئے افراد کے اہل خانہ کی تکلیف، اپنوں سے بچھڑنے کا درد افسانے کی ہر سطر سے عیاں ہے۔اول الذکر میں "ایبولا" مرض کے بڑھتے اثرات، نسل در نسل منتقل ہوتی بیماری کے خوف کو فطری انداز میں موثر پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔اس افسانے کے مطالعے سے موجودہ کرونائی حالات کی دردناک تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔جہاں ہر طرف لامتناہی اموات کا سلسلہ، ایک ایک کر کے اپنوں سے دور ہونے کا غم، رشتوں میں آتے فاصلے، عزیزوں کے تڑپنے کا کرب سب کچھ قاری خود پر گزرتا محسوس کرتا ہے۔

آخر الذکر افسانے میں "الزائمر" کے مرض میں مبتلا مریض اور اس سے جڑے رشتوں کی تکلیف نمایاں ہے۔یہ افسانہ سائنس و ادب کا حسین امتزاج ہے۔جس میں الزائمر کے جینٹک بیماری ہونے کی تفصیل دلچسپ افسانوی انداز میں اس طرح پیش کی گئی ہے کہ قاری نہ صرف بیماری کی وجوہات، مضر اثرات سے واقف ہوتا ہے بلکہ اس بیماری میں مبتلا مریض اور اہل خانہ کی ذہنی و دلی کیفیات، کرب کو بھی دل سے محسوس کرتا ہے۔

مجموعے میں شامل دیگر افسانوں میں ''پت جھڑ کے لوگ'' عورت کی بےلوث محبت کی داستان ہے جس میں نئی نسل کی خودسری پر بھی چوٹ کی گئی ہے۔''پگلا'' اپنے موضوع اور پیش کش کے اعتبار سے کامیاب افسانہ ہے۔جس میں مفلسی، بےبسی، جواریوں کی غیر مستقل مزاجی، معصوم بچے کی اپنے بھائی کی روح کو سکون پہنچانے کی کوششوں کو افسانوی پیرائے میں پیش کیا گیا ہے افسانے کا موضوع اور 'بوڑھا'' کردار اپنے خودغرضانہ فعل کے باعث پریم چند کے افسانہ ''کفن'' اور اس کے مرکزی کردار ''گھیسو اور مادھو'' کی یاد دلاتے ہیں۔ان کرداروں کی سوچ، بےبسی، خودغرضی، وقتی خوشی، ندامت، ڈھیٹ پن، وہ مشترکہ خصوصیات ہیں۔جو قارئین کے دل میں ان کرداروں سے نفرت کے باوجود ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

افسانہ ''مٹھی میں بند چڑیا'' عورت کی بےبسی اور مرد کی مردانگی کی تصویر پیش کرتا ہے۔افسانے میں'' چائلڈ ابیوز'' کو موضوع بنایا گیا ہے۔شعاع ایک ایسی بےبس چڑیا ہے، جو کم عمری میں پہلی بار سراج کی بند مٹھی میں مسلی گئی۔پھر یہ سلسلہ کئی بار چلتا رہا، لیکن ہر بار مٹھی میں بند چڑیا، پھڑ پھڑا کر، تڑپ کر، سسک کر رہ گئی۔شعاع کو سراج کا، معاشرہ کا ڈر خاموش رہنے پر مجبور کرتا رہا لیکن سراج کے مہلک بیماری ایڈز میں مبتلا ہونے کی خبر شعاع کو دلی سکون عطا کرتی ہے۔

افسانے میں جہاں لڑکیوں کی جنسی استحصال کی درد بھری داستان بیان ہوئی ہے وہیں لڑکوں کے جنسی بے راہ روی کے خطرناک نتائج ایڈز جیسی مہلک بیماری کی صورت سامنے لاکر، اس سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔

افسانہ ''سورج کی موت'' چڑھتے سورج کی پوجا محاورہ پر مکمل صادق آتا ہے۔افسانے کا کردار لیاقت خاں کا ساہوکاری ختم ہوجانے کے بعد بھی اپنی نام نہاد ''میں پن'' کے زعم میں رہنا، ایسے کئی جاگیرداروں، نوابوں کی یاد دلا رہا ہے جو چاہ کر بھی اپنے سنہرے ماضی کو بھولنا نہیں چاہتے۔زمینداری، جاگیرداری ختم ہوجانے کے باوجود، اپنی بڑائی کا بھرم رکھنا چاہتے ہیں۔انھیں یہ حقیقت قبول کرنے میں مشکل پیش آتی ہے کہ اب ان کے نوابی ٹھاٹ نہیں رہے، گاؤں میں اب کم تر طبقے کے افراد اپنی تعلیم سے ان سے بڑا عہدہ حاصل کر، ان سے زیادہ مال دار بن گئے ہیں۔افسانہ لیاقت خان کی دلی کیفیت اور بدلے حالات اور رویوں کا عکاس ہے۔

افسانہ ''میری'' سائنس کی ترقی، ڈونر، پرائی کوکھ کا وضاحتی اشارہ ہے جس میں ایک ماں کے احساسات کی حقیقی ترجمانی ملتی ہے۔افسانے کا مرکزی کردار میری اپنے کوکھ میں کسی اور کے بچے کو سینچتی تو ہے لیکن جسم سے جدا ہوتے ہی اپنی گود خالی کر کسی اور کی گود بھرنے پر مجبور ہوجاتی ہے۔ایک ماں کا اپنے بچے کو خود سے جدا کرنا، تکلیف دہ عمل ہے۔افسانہ ان ہی تکلیف دہ جذبات واحساسات کا عمدہ اظہاریہ ہے۔

مجموعہ کا آخری افسانہ ''میرے محافظ'' اسلوب اور کردار نگاری کے اعتبار سے فیبل کے زمرے میں آتا ہے۔جس میں دو بوڑھی گائیں اہم کردار ہیں۔افسانہ عصر حاضر کے ایک اہم موضوع اور مسئلے ''گئو رکھشک اور ان کے فرقہ وارانہ نظریات'' کی حقیقت بیان کر رہا ہے۔افسانے میں بے زبان جانور اپنے گاؤں سے محافظوں کی تلاش میں در در بھٹکتی پھرتی ہیں۔لیکن ہر جگہ سے ٹھکرائی جاتی ہیں۔ان کے نام نہاد محافظ کا کہیں کوئی نشان نہیں ملتا، تھک ہار کر، قسمت سے وہ اسی در پر پہنچتی ہیں، جس در کے مکیں کو محافظوں نے (گئو ماتا) قاتل قرار دیا ہے۔رحیم خان جو پیشہ سے قصائی ہے۔لیکن ان دنوں ملک میں آئے نئے قانون اور گئو رکھشکوں کے ڈر و خوف کی وجہ سے بے روزگاری کی مار جھیلنے پر مجبور ہوگیا ہے۔اسی کو بوڑھی گایوں کی کمزوری، بدحالی پر رحم آتا ہے۔وہ ان کے لیے چارہ اور پانی کا انتظام کرتا ہے۔لیکن اس کی بیوی ساجدہ گئو محافظ کی قہر سے اس قدر سہمی ہوئی ہے کہ وہ ان گایوں کو گھر سے نکال دیتی ہے۔

سلمیٰ صنم کے اسلوب کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ ان کے افسانوں کا راوی اکثر خود کلامی کے چند جملے بار بار دوہراتا ہے۔یہ جملے معنی خیز اور افسانے کی جان ہوتے ہیں جو قاری کے لیے موضوع کی گہرائی اور گیرائی تک رسائی حاصل کرنے میں معاون بھی ہیں۔اس کے علاوہ افسانوں کے پرتجسس آغاز اور غیر متوقع انجام، قاری کو چونکنے اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔

سلمیٰ صنم صاحبہ نے اپنے افسانوں کو نئی تشبیہات، استعارات اور علامتوں سے سجایا ہے جس کو ان کے رواں عام فہم اسلوب نے مزید دلکش اور پراثر بنادیا ہے۔

مجموعی طور پر ''قطار میں کھڑے چہرے اور دیگر کہانیاں'' میں شامل سلمیٰ صنم صاحبہ کے افسانے عصر حاضر کے متنوع موضوعات کا احاطہ کرنے میں کامیاب ہیں جس میں معاشرے اور معاشرتی رویوں اور مسائل کی تبئیں ان کی فکر متشرح ہے۔□□□

Dr. Aisha Farheen
Bi Bi Raza PU College
Khaja Colony
Gulbarga-585104 (Karnataka)

ڈاکٹر بی بی رضا خاتون

رضیہ سجاد ظہیر
بحیثیت خاکہ نگار

''نوع انسان کا دلکش ترین مرکز مطالعہ ہمیشہ سے انسان رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔'' ادب کی دو اصناف سوانح اور خاکے ہمیں انسان سے متعارف کراتی ہیں۔ خاکہ شخصیت کی عکاسی کا نام ہے۔ اچھا خاکہ دراصل کسی شخصیت کا معروضی مطالعہ ہے۔ عموماً مختلف شعبۂ حیات میں کارہائے نمایاں انجام دینے والے کامیاب اور نامور لوگوں کے خاکے لکھے جاتے ہیں۔ کامیابی کو ناپنے کا ہمارا پیمانہ دولت اور شہرت ہے۔ کیا ایک معمولی اور عام آدمی کا بھی خاکہ لکھا جاسکتا ہے؟ جواب ہے ہاں۔ مولوی عبدالحق نے نام دیو مالی اور رشید احمد صدیقی نے ''کندن'' چپراسی کا خاکہ لکھ کر اس کلیشے کو توڑا کہ کسی عظیم علمی یا ادبی شخصیت کا ہی نہیں بلکہ معمولی انسان کا بھی خاکہ لکھا جاسکتا ہے۔ رضیہ سجاد ظہیر کے خاکوں میں زیادہ تر عام اور معمولی انسان ہیں، لیکن مصنفہ کی ذوقِ نظر ان میں کچھ ایسی خوبیاں اور ایسے گُر ڈھونڈ نکالتی ہے جو انھیں بے حد خاص بناتے ہیں۔ عام انسان کے حوالے سے ''آبِ گم'' میں مشتاق احمد یوسفی نے بہت خوبصورت بات لکھی ہے:

''ان میں جو کردار مرکزی، ثانوی یا محض ضمنی حیثیت سے ابھرتے ہیں، وہ سب کے سب اصطلاحاً بہت ''عام'' اور سماجی رتبے کے لحاظ سے بالکل ''معمولی'' ہیں، اسی لیے خاص التفات اور تامّل چاہتے ہیں۔ میں نے زندگی کو ایسے ہی لوگوں کے حوالے سے دیکھا، سمجھا، پرکھا اور چاہا ہے۔ اسے اپنی بدنصیبی ہی کہنا چاہئے کہ جن ''بڑے'' اور ''کامیاب'' لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا، انھیں بحیثیت انسان بالکل ادھورا، گرہ دار اور ایک رُخا پایا۔ کسی دانا کا قول ہے کہ جس کثیر تعداد میں قادرِ مطلق نے عام آدمی بنائے ہیں، اِس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں بنانے میں اُسے خاص لطف آتا ہے، وگرنہ اتنے سارے کیوں بناتا۔ اور قرن ہا قرن

سے کیوں بناتا چلا جاتا۔ جب ہمیں بھی یہ اتنے ہی اچھے اور پیارے لگنے لگیں تو جاننا چاہئے کہ ہم نے آپ کو پہچان لیا۔''

(آب گم، ص23)

رضیہ سجاد ظہیر کے خاکوں میں سے اکثر کردار ایسے ہیں جنھیں ہم زبانِ عام میں عام آدمی کہتے ہیں۔ ان خاکوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر عام انسان میں کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور ہوتی ہے، لیکن اسے دیکھنے اور سمجھنے کے لیے بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت درکار ہے جو رضیہ سجاد ظہیر میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کی انسان دوستی، روشن خیالی، وسیع النظری، انسان کو دولت، شہرت، طبقے، مذہب اور سماجی رتبے سے پرے دیکھتی ہے۔ وہ انسانیت اور اعلیٰ اقدار کو افضل تصور کرتی ہیں۔

رضیہ سجاد ظہیر کے خاکے نہایت سادہ اور دلکش ہوتے ہیں۔ تکلف اور تصنع سے پرے یہ خاکے انسان کی ان بنیادی خصوصیات اور اوصاف کو پیش کرتے ہیں جو ایک انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتے ہیں۔ خاکوں میں اصحابِ خاکے سے ان کا خلوص اور وابستگی ان خاکوں کو موثر بناتی ہے۔

شرافت، نیک نفسی، قلندرانہ صفت، بے نیازی، وفاداری، جذبۂ ایثار، اپنے کام سے بے انتہا شغف، استغناء (قناعت)، بے لوث محبت، احساسِ ذمہ داری، ، وسیع النظری، فراخ دلی، دوسروں کے دکھ درد کا احساس، درد ِدل، احترامِ انسانیت جیسے اوصاف کے حامل ان کے خاکے انسان دوستی کے آفاقی تصور کو پیش کرتے ہیں۔

رضیہ سجاد ظہیر کی دو تصانیف ''اللہ دے بندہ لے'' اور ''زرد گلاب'' ایسی ہیں جن میں افسانے اور خاکے دونوں شامل ہیں۔ دراصل رضیہ سجاد ظہیر کے خاکوں اور افسانوں میں فرق کرنا بڑا مشکل ہے۔ اکثر افسانوں میں ایک مرکزی اور نمایاں کردار ہوتا ہے اسی کے اردگرد کہانی گھومتی ہے جس پر خاکے کا گمان ہوتا ہے اور خاکوں میں افسانوی رنگ پایا جاتا ہے۔

''اللہ دے بندہ لے'' میں بادشاہ، نیچ، نگوڑی چلی آوے ہے، رئیس بھائی، سورج مل، اللہ دے بندہ لے، اب پہنچانو، راکھی والے پنڈت جی، لاوارث، تلی تال سے چینا مال تک، انتظار ختم ہوا انتظار باقی ہے وغیرہ ایسی تحریریں جو خاکہ کی تعریف پر پوری اترتی ہیں اور ان کا دوسرا افسانوں اور خاکوں کا مجموعہ ''زرد گلاب'' ہے جس میں لنگڑی ممانی، ستون، ایک یاد وغیرہ خاکے شامل ہیں۔

رضیہ سجاد ظہیر عام طور پر عام انسان کہلانے والی شخصیتوں کی منفرد اور نمایاں خصوصیات کو اس خوبی سے بیان کرتی ہیں کہ ان کی مکمل اور متحرک تصویریں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ ان کرداروں کی وضع قطع، رکھ رکھاؤ، عادات و اطوار، سیرت و افکار کی عکاسی قاری کو متاثر کرتی ہے اور اس تاثر ہی میں خاکہ کی کامیابی کا راز مضمر ہوتا ہے۔

''اللہ دے بندہ لے'' کا پہلا خاکہ ''بادشاہ'' ہے۔ اس خاکے کو پڑھتے ہوئے رشید احمد صدیقی کے خاکے ''کندن'' اور مولوی عبدالحق کے خاکے ''نام دیو مالی'' کی یاد آجاتی ہے۔ اوصاف حمیدہ کا تعلق کسی مذہب، ذات یا طبقے سے نہیں ہے بلکہ یہ کسی بھی انسان میں ہو سکتی ہیں۔ کسی بھی سماج میں زندگی کے نظام کو برقرار رکھنے میں ہر چھوٹے اور بڑے کام کی اتنی ہی اہمیت ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ ہندوستانی سماج میں جس طرح طبقاتی نظام قائم کیا گیا ہے، جسے اعلیٰ طبقہ اور نچلا طبقہ کہا جاتا ہے اسی طرح پیشوں کے اعتبار سے بھی سماج کو اعلیٰ اور ادنیٰ طبقوں میں بانٹا گیا ہے۔ لیکن اعلیٰ انسانی قدروں کی حامل رضیہ سجاد ظہیر انسان کو بحیثیت انسان پرکھتی ہیں اور جنھوں نے انھیں متاثر کیا کسی تفریق کے بغیر انھیں اپنے خاکوں کا موضوع بنایا۔ اُن کی اچھائیوں، ایمانداری، دردمندی، قناعت پسندی، خود اعتمادی، ہنرمندی اور انسان دوستی جیسے اوصاف کو اپنے خاکوں میں اجاگر کیا ہے۔

بادشاہ عرف بابولال کی قلندرانہ صفت، استغنا، خود اعتمادی اور ہنرمندی اسے ایک دلچسپ کردار بناتی ہے۔ وہ ہرفن مولا ہے، کرسیاں بھی بن دیتا ہے، مستری کا کام بھی کرتا ہے، پلمبر کا کام بھی۔ اسی طرح کے مختلف چھوٹے بڑے کام بخوبی انجام دیتا ہے۔ اپنے کام کو نہایت ایمانداری، انہماک اور دلجمعی سے انجام دیتا ہے اور اپنی اجرت سے ایک پیسہ بھی بڑھ کر نہیں لیتا اور کوئی دینے لگے تو کہتا ہے کہ اللہ نے مجھے بہت دیا ہے کہاں رکھوں گا۔ بازار میں سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی دکان ہے اور اسی سے متصل ایک جھونپڑی جو اس کی کل کائنات ہے۔ اس کے گھر میں کوئی اور نہیں ہے سوائے ایک پالتو بلی کے۔ اس کا ایک عزیز رشتے دار کی طرح خیال رکھتا ہے۔ اسے اپنا کام کر کے طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ قناعت سے جو ذہنی آسودگی ملتی ہے وہ امیری غریبی سے پرے انسان کو قلبی سکون عطا کرتی ہے۔ مصنفہ لکھتی ہیں:

''بابولال تم واقعی بادشاہ ہو۔ بھلا بادشاہوں کو بھی یہ نیند کہاں میسر؟ یہ تو اسی کا حصہ ہے جس کے دل میں قناعت کا نور ہو، سر میں ہنر اور محنت کا غرور، پھر وہ چاہے چیتھڑوں میں لیٹا ہو مگر وہ بادشاہ نہیں تو پھر کون بادشاہ ہے۔''

بابولال کی زبان میں لکنت ہے۔ وہ ہکلاتا ہے، لیکن لکنتِ زبان کا اس کی خود اعتمادی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ کہتا ہے کہ میرا دماغ زیادہ تیز چلتا ہے۔ زبان اس رفتار کا ساتھ دینے سے قاصر ہے اسی لیے لڑکھڑا جاتی ہے۔

بابولال بظاہر انپڑھ سا معمولی انسان ہے لیکن اس کی فکر بڑی ہے۔ مذہبی تعصب اور نفرت سے بیزار انسانیت کا پرستار ہے۔ مصنفہ جب اس سے اس کے مذہب کے بارے میں سوال کرتی ہیں تو وہ کہتا ہے:

''میرا نام ہے بابولال۔ بابولال کے معنی سمجھتی ہو؟ ب ب
بابو کا بیٹا۔ تم کو جئے ہند تو کیا تھا م م مسلمان ہوتا تو سلام کرتا۔
ہندو ہوتا تو نمسکار۔ م م میں نے کہا دونوں کو گ گ گولی مارو،
جئے ہند س س سب سے اچھا......''

رضیہ سجاد ظہیر نے جن لوگوں کے خاکے لکھے ہیں ان میں زیادہ تر وہ شخصیات ہیں جنھیں وہ بچپن سے جانتی تھیں اور یہ شخصیات ان کی یادداشت کا حصہ بن گئی تھیں۔ گویا ان میں بہت سے خاکے ان کے بچپن کی یادوں کی لفظی تصویریں ہیں، جس میں عقیدت، احترام، محبت، دوستی جیسے جذبات کارفرما ہیں۔ انھوں نے ان خاکوں میں اپنی قوتِ تخلیق اور فنی بصیرت سے جان ڈال دی ہے۔

اس نوعیت کے خاکوں میں راکھی والے پنڈت جی، رئیس بھائی، سورج مل، اللہ دے بندہ لے (فخرو)، لنگڑی ممانی، نگوڑی چلی آوے ہے (جلّو خالہ)، ایک یاد (ابراہیم)، ستوں (امیر خاں) وغیرہ ہیں۔ آس پاس کی دنیا کے یہ وہ کردار ہیں جن کی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو نے رضیہ سجاد ظہیر کو اس قدر متاثر کیا اور وہ ان کے ذہن و دل میں ایسے بس گئے کہ ان کے لاشعور کا حصہ بنے رہے۔ جب انھوں نے کاغذ قلم کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا تو بچپن کی یادوں کے گلیاروں میں بسنے والے ان کرداروں کو صفحۂ قرطاس کی زینت بنایا۔

راکھی والے پنڈت جی کے خاکے میں رضیہ سجاد ظہیر نے اپنے گھر کے ماحول اور اس میں پائی جانے والی مذہبی ہم آہنگی و رواداری کے بے حد حسین منظر پیش کیے ہیں۔ وہ گنگا جمنی تہذیب کی پروردہ تھیں۔ ان کے گھر میں راکھی کا تیوہار بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اصل میں ان کے والد کی بہن کا جوانی میں انتقال ہوگیا تھا۔ مصنفہ کہتی ہیں:

''اس لیے ابا کو بہنیں بنانے کا بڑا چاؤ تھا۔ ان کی دو ہندو بہنیں
بھی تھیں جو راکھی کے دن خاص کر آیا کرتی تھیں۔''

اس دن ان کے گھر میں بڑی چہل پہل ہوا کرتی تھی۔ بہنوں کو تحفے کے طور پر دیئے جانے والی تھال صبح ہی سے سجائے جاتے، جن میں ریشمی بنارسی کپڑے اور ان کے بچوں کے کھلونے اور چوڑیاں، جھنڈولے ناریل، سندور، مہندی اور سوکھے میوے وغیرہ رکھے جاتے تھے۔ پنڈت جی مذہبی فرائض کی ادائیگی کے لیے راکھیاں لے کر آجاتے تھے۔ اور انھیں بھی نذرانے کے طور پر بہت سارا سامان دیا جاتا تھا۔ سماجی رشتوں کے تانے بانوں سے بُنا گیا یہ کہ خاکہ پنڈت جی کے حوالے سے اس دور کے انسانوں کی بے تعصبی، احترام مذاہب کے ذریعے احترام انسانیت کی فلاسفی سے روشناس کراتا ہے۔

حساب میں کچے رئیس بھائی کا خاکہ نہایت مختصر ہے۔ اس میں ان کی حساب کے مضمون میں کم فہمی کو شگفتہ انداز پیش کیا ہے۔ دن رات کی محنت کے باوجود میٹرک میں حساب کے پرچے میں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ نوکری کی تلاش میں بمبئی چلے گئے اور وہاں سے ماسٹر صاحب جو مصنفہ کے والد ہیں ان کے نام خط لکھا کہ انھیں سو روپۓ ماہانہ تنخواہ کی نوکری مل گئی ہے اور خط میں یہ بھی اطلاع دی کہ ان کی تنخواہ میں پانچ روپیہ سالانہ ترقی ہوگی اور یہ آٹھ سو تک جائے گی۔ تو انھوں نے کہا کہ جب آٹھ سو روپۓ ہوجائے گا تو اجمیر آپ سے ملنے آؤں گا اور بی بی (مصنفہ جو اس وقت بچی تھیں) کے لیے گڑیا اور کھلونے لاؤں گا۔ اس کردار میں Common Sense کی کمی ہے اور حساب میں کمزوری سے لطیف مزاح پیدا کیا ہے۔ وہ یہ بھول گئے کہ پانچ سو روپۓ سالانہ کی ترقی میں آٹھ سو روپۓ تنخواہ ہونے تک کتنے برس بیت جائیں گے اور یہ چھوٹی سی بچی، بچی نہیں رہے گی۔

سورج مل مصنفہ کے والد کے کالج میں چپراسی ہے، گھر کا کام بھی کرتا ہے۔ اس میں راجپوتانہ شان اور وضع داری باقی ہے۔ وہ اپنے فرض کو نبھاتے ہوئے اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ سورج مل، اس معمولی سے کردار میں خاکہ نگار نے زندگی کو پیش کیا ہے۔ مصنفہ بچپن میں ان سے کہانیاں سنا کرتی تھیں۔ وہ راجپوتوں کی بہادری، عورتوں کی عزت کرنے کا انداز، وعدہ وفائی اور دوستی کے قصے سنایا کرتے تھے۔ خاکہ نگار نے اپنے بچپن کے ایک واقعے کے ذریعے ان کے کردار ان اوصاف کو نمایاں کیا ہے۔ سورج مل نے اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر مصنفہ کے خاندان کی جان بچائی اور ان کی ماں کی پردہ داری کا مان رکھا۔

ایک موقع پر جب خاکہ نگار کی والدہ پردے کے اندر بگھی پر جا رہی تھیں تو اس کا پہیہ الگ ہوگیا اور ان کی والدہ بھی گھبراہٹ میں گاڑی کا دروازہ کھول کر کودنا چاہتی تھیں کہ سورج مل کے بوڑھے مگر مضبوط ہاتھوں نے ان کو روک دیا پھر، چشم زدن میں انھوں نے نکلے ہوئے پہیہ کی جگہ اپنا کندھا لگا دیا اور گاڑی سیدھی کھڑی ہوگئی۔ وہ لکھتی ہیں کہ:

''پھر وہ وہیں گاڑی کے نیچے سے چیخ چیخ کر اماں سے کہنے
لگے کہ اترنے اور بے پردہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں،

کیونکہ عزت دنیا میں سب سے بڑی چیز ہے۔“

بظاہر یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے لیکن اس میں دوستی اور وفاداری کی کتنی عظیم مثال پیش کی گئی ہے۔

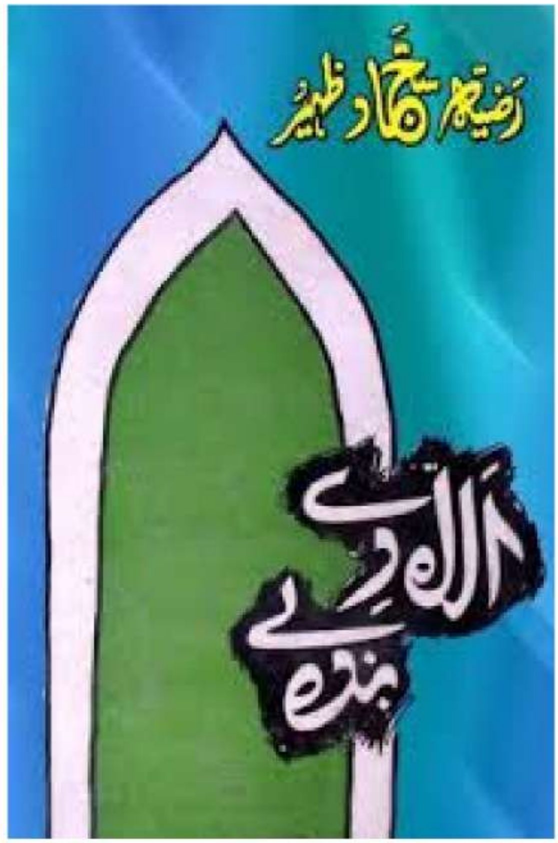

”اللہ دے بندہ لے“ ایک دلچسپ خاکہ ہے۔ فخرو ایک گھریلو ملازم ہے اور مصنفہ کے ماموں وکیل صاحب کے گھر کام کرتا ہے۔ اپنی ذمہ داری بخوبی نبھاتا ہے دوسرے بھلائی کے کام بھی کرتا ہے لیکن نماز پڑھنے سے جی چراتا ہے۔ جب بھی مالک اسے نماز پڑھنے کو کہتے ہیں وہ ایسا جواب تیار رکھتا ہے یا ایسی تاویلات بیان کرتا ہے کہ کہنے والے سر پکڑ کر بیٹھ جائیں۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ اس کے پاس ایک جوڑی جوتے (بوٹ) ہوں وہ اپنی تنخواہ سے اتنے قیمتی جوتے نہیں خرید سکتا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہتا ہے اور جب مالک یہ کہتے کہ چل مسجد میں نماز پڑھ کر دعا مانگو گے تو ضرور قبول ہوگی تو وہ حجت کرنے لگتا کہ اللہ تعالیٰ تو ہر جگہ اور ہر وقت موجود ہے۔ اپنے علم کے مطابق دلائل دینے کی کوشش کرتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کنویں سے دعا کی، حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ سے دعا کی......تو اللہ تعالیٰ تو ہر جگہ سے کی گئی دعا سنتے ہیں اور قبول کرتے ہیں۔ جب بھی نماز کے لیے کہا جاتا وہ سرے سے انکار بھی نہیں کرتا لیکن باتیں اور بہانے بنا کر ٹال دیتا ہے۔

خیر خیر کر کے ایک دن اس کی دعائیں رنگ لائیں اور وکیل صاحب کے ایک دوست جن کا مقدمہ انھوں نے جیتا تھا فخرو کو مہنگے جوتے تحفے کے طور پر دے دیے۔ وہ جوتے پہن کر دوست کے ہمراہ مسجد کے پاس سے گزر رہا تھا کہ مالک نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ آج تو تمھیں ہر حال میں نماز ادا کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ تمھاری اتنی بڑی اور دیرینہ خواہش پوری ہوگئی۔ اس دن اس کے پاس کوئی معقول بہانہ نہیں تھا لہٰذا وہ نماز کے لیے مسجد میں داخل ہوگیا۔ نماز ادا کی اور جب واپس ہو رہا تھا تو دیکھا کہ اس کے نئے قیمتی جوتے چوری ہوگئے ہیں۔ بہت آزردہ ہوا۔ ایک دن جب مولوی صاحب وعظ کے لیے کھڑے ہوئے تو اس نے اجازت مانگی کہ مجھے کچھ کہنا ہے مولوی صاحب نے اجازت دے دی۔

> ”فخرو لوگوں کو مخاطب کر کے بولا، ”بھلے آدمیوں، نرسوں یہاں سے میرا نیا بوٹ چوری ہوگیا۔ نمازیوں کے سوا تو کوئی یہاں آتا نہ ہے سو کسی نمازی نے ہی لیا ہووے گا۔ خیر، پر میں نے سوچا کہ جس مسجد میں جوتا گیا سو ہوئیں گے پالش کی ڈبیہ اور برش بھی چلا جاوے سو وہ میں لیتا آیا ہوں اور آپ نمازیوں کو بخش دوں ہوں۔ اللہ سے دعا مانگوں گا کہ ایک بار دیا تھا سو دوسری بار بھی دیوے اور وِس کی کریمی سے کچھ دور نہ ہے۔ دیوے گا اور پھر دیوے گا۔ ضرور دیوے گا۔“

(اللہ دے بندہ لے، ص130)

فخرو نماز پابندی سے نہیں پڑھتا لیکن اُسے خدا کی ذات پر کامل یقین ہے کہ وہ دعا مانگے گا تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور عطا کرے گا۔ بین السطور میں یہ سوال اٹھاتا ہے کہ جو نمازیں پابندی سے ادا کرتے ہیں انھیں اللہ تعالیٰ پر یقین کیوں نہیں ہے۔ وہ اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے چوری جیسا گناہ کرتے ہیں۔

رضیہ سجاد ظہیر اپنے خاکوں میں شخصیت کے حوالے سے کسی نہ کسی اخلاقی اور سماجی پہلو کو اجاگر کرتی ہیں، جیسے خاکہ لاوارث میں انھوں نے اپنی ٹیچر مس گنگولی کی زندگی میں تنہائی کے کرب اور گمنام موت کے ذریعے سماج کی اس تلخ حقیقت کو پیش کیا ہے جہاں اولاد عمر رسیدہ والدین کو اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتی۔ اولڈ ایج ہوم یا پھر اکیلا پن ان کی زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں۔

’اب پہچانو‘، ایک بھکارن کا خاکہ ہے جس سے مصنفہ کا ہر دن کا

آمنا سامنا ہوتا ہے۔ مصنفہ اپنے تجربات اور مشاہدات بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ وہ صاف صفائی سے نہیں رہتی، دیکھنے والوں کو اس سے کراہت محسوس ہوتی ہے۔ وہ نہایت ڈھیٹ ہے کسی کے پیچھے پڑ جائے تو کچھ لیے بغیر پیچھا نہیں چھوڑتی۔ دکانداروں سے سامان مانگ کر، گڑگڑا کر یا ہٹ دھرمی سے لے لیتی ہے۔ کوئی اسے خیرات نہ دے تو اسے جی بھر کے گالیاں دیتی ہے، کوستی ہے۔ اس کی یہ تمام حرکتیں مصنفہ کے دل میں اس کے لیے نفرت سی پیدا کرتی ہیں۔ ریڈیو پر جب جنگ کی خبریں نشر ہوتیں تو وہ بہت دھیان سے خبریں سنتی تھی۔ جنگ کے زمانے میں عوام سے امداد کی گزارشیں کی جانے لگیں۔ چندہ اکٹھا کرنے کے لیے ایک دن خواتین کے ایک بہت بڑے اجتماع کا انعقاد عمل میں آیا۔ جہاں دولت مند خواتین سینکڑوں، ہزاروں روپیوں کا چندہ دے کر داد و تحسین وصول کر رہی تھیں۔ وہیں یہ بھکارن اپنا زندگی بھر کا سرمایہ جسے وہ گٹھری میں باندھ کر رکھتی تھی وہ چندے کے طور پر دے جاتی ہے۔ اسے کوئی نہیں جانتا، اس کے لیے کسی نے تالیاں نہیں بجائیں، کوئی ستائشی الفاظ اس کے لیے نہیں کہے گئے۔ نام و نمود سے بے پرواہ اس کی یہ بے نیازی قاری کو متاثر کرتی ہے۔

اس واقعہ نے مصنفہ کو جھنجھوڑ دیا کہ ہم لوگوں کے ظاہر کو دیکھ کر ان کے بارے میں رائے قائم کر لیتے ہیں جبکہ انسان کی باطن کی پاکیزگی، کشادہ دلی، سخاوت اور دردمندی کو سمجھنے کے لیے اس کی روح تک رسائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ایک واقعہ، ایک قدم، غلط فہمیوں، تنگ نظری، حقیقت سے عدم واقفیت کے سبب بنی دیوار کو مسمار کر دیتا ہے تو حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے، انسانی فطرت کی گرہیں کھلتی چلی جاتی ہیں، کسی کو جاننے اور پہچاننے کا فرق واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔

اس طرح اس کے جذبے سے اس کی شخصیت کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ بظاہر ایک بالکل معمولی بھکارن جسے سماج میں کوئی اہمیت حاصل نہیں لیکن اس میں جو جذبہ پیوست ہے اس کو خاکہ نگار نے بڑے پر اثر انداز میں پیش کیا ہے۔

لنگڑی ممانی زرد گلاب کا سب سے عمدہ خاکہ ہے۔ ممانی پورے خاندان اور محلے میں ایک باوقار اور مخلص انسان کے طور پر جانی جاتی ہیں۔ اس کردار کی وضع داری، خودداری، دردمندی، چھوٹوں سے شفقت اور محبت، نوجوانوں سے رعب و تمکنت اور بزرگوں سے اپنائیت اور خلوص قاری کو متاثر کرتا ہے۔ ایک رشتے کو دل سے مان لینے کے بعد پوری زندگی اس رشتے کی نذر کر دینا اس کردار کو بے مثال بنا دیتا ہے۔ ان کی شادی تیرہ برس کی عمر میں ہو رہی تھی بارات لے کر آتے ہوئے راستے میں ایک حادثے میں دولہے کا انتقال ہو گیا۔ شادی کا گھر ماتم خانہ بن گیا۔ مصنفہ لکھتی ہیں:

> ''اس واقعہ کے بعد، بہت سے لوگوں نے یہاں تک کہ ان کے ماں باپ نے بھی اشاروں میں ان سے کہا اور اوروں سے بھی کہلوایا کہ ان کا رشتہ کہیں اور کر دیا جائے کیونکہ وہ تو کنواری ہی تھیں۔ نکاح تک تو ہوا نہیں تھا، شادی اور رخصتی کو کون کہے۔ پر انھوں نے جو 'نہ' کی تو پھر 'ہاں' کہنے کا نام نہیں لیا۔'' (زرد گلاب، ص 49)

خواتین سے متعلق رضیہ سجاد ظہیر کے خاکوں کی زبان میں نسوانی لب و لہجے کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یو پی کے مغربی اضلاع کے متوسط طبقے کی گھریلو زندگی اور وہاں کی زبان اور لہجے کی انفرادیت سے مصنفہ گہری واقفیت رکھتی ہیں۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں رضیہ سجاد ظہیر کا لڑکپن گزرا۔ انھوں نے اس پوری فضا کو اس کردار کے ذریعہ سمیٹ لیا ہے۔ دراصل یہ محض ایک دلچسپ اور پُر لطف خاکہ نہیں بلکہ اس میں ایسے فرد کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے جو غم و الم کے ماحول میں بھی اپنے کو دوسروں کی خوشی کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ ایسا ہی ایک خاکہ جلو خالہ کا ہے جسے مصنفہ نے صاحبِ خاکہ کے تکیہ کلام ''نگوڑی چلی آوے ہے'' کو عنوان بنا کر پیش کیا ہے۔ یہ زندگی سے بھرپور ایک ایسی خاتون کا خاکہ ہے جو ہر دم ہنستی مسکراتی رہتی ہے۔ ان کا نام تو جلیل فاطمہ ہے لیکن انھیں بڑے بزرگ جلّو، اور چھوٹے جلّو خالہ، جلو آپا، جلو ممانی اور جلو پھوپی وغیرہ کہتے ہیں۔ یہ نہایت خوش مزاج اور زندہ دل کردار ہے۔ بات بے بات کھلکھلا کر ہنسا کرتیں ہیں۔ اس بے اختیار ہنسی پر کوئی ناراض ہوتا یا شکایت کرتا تو کہتیں کہ ''ہنسی تو نگوڑی چلی آوے ہے۔''

اس بے اختیار ہنسنے کی عادت کے سبب ان کے شوہر نے انھیں طلاق دے دی، لیکن ان کی عادت نہ بدلنی تھی نہ بدلی۔ اُس واقعے کو اس طرح بیان کرتی ہیں:

> ''میں نے اندر سے گرتالا کے تیرے خالو کو پکڑا دیا، پھر پیڑھی پر بیٹھی اور اتّے لوئی بنا کے چنگیر بناؤں تھی کہ کیا دیکھوں ہوں، اے کرمردوا آنگن بھر میں ناچتا پھر رہا ہے۔ ایسا ایسا اچھل رہا ہے کہ جیسے وہ سرکل آیا تھا نہ وس میں ایک آدمی نہ تھا جسے سب کوئی جوکر کئے رئے تھے۔ اور میں کمبخت ہنسنے لگی۔ بس اور لگا چیخنے۔ اور تم ہنسو..........ایں..........اماں نے لقمہ دیا۔ تو بھوا ب تو ہی انصاف سے بتا۔ نگوڑی ہنسی تو چلی آوے ہے۔ جب آنگن بھر میں کوئی ناچتا پھرے گا تو ہنسی نہ آوے گی۔ وہ تو

کھو خیریت گزری کہ چولہے میں نہ جا پڑا۔ تو پھر اسی بات پر اس نے مجھے طلاق دے دی۔"

(زرد گلاب، ص52)

فطرتاً زندہ دل اور ہنس مکھ انسان زندگی کے بڑے سے بڑے غم کو اپنی مسکراہٹوں میں آنسوؤں کے سمندر اپنے بے لاگ قہقہوں میں چھپانے کا ہنر جانتے ہیں۔ خود ہنس کر آس پاس والوں کو ہنسانا اور ان کا غم غلط کرنا اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں۔

"انتظار ختم ہوا، انتظار باقی ہے" سجاد ظہیر کا خاکہ ہے۔ سجاد ظہیر کی اچانک موت کا صدمہ اور زندگی بھر کبھی نہ ختم ہونے والا انتظار اس خاکے کو رنجیدہ بناتے ہیں۔ اس میں رضیہ سجاد ظہیر نے سجاد ظہیر کے معمولاتِ زندگی، عادات و اطوار، منکسر المزاجی، انسان دوستی، خوش اخلاقی، وسیع النظری اور سادہ لوحی کو بیان کیا ہے۔ ان کی شخصی زندگی کے حوالے سے لکھتی ہیں:

"میں ان کی کچھ ایسی صفات کا ذکر کرنا چاہتی ہوں جو بادی النظر میں بالکل معمولی بات لگتی ہیں لیکن جن سے ہی دراصل ان کی عظیم شخصیت مرکب تھی۔ مثلاً اچھے کھانے کے حد درجہ شوقین ہوتے ہوئے بھی مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے کبھی بھی بدمزہ کھانے پر نکتہ چینی کی ہو۔"

(اللہ دے بندہ لے، ص149)

ان کی خوش مزاجی کے حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"انھیں جوش ملیح آبادی کی ایک رباعی کے یہ دو مصرعے بہت پسند تھے:

یا احمق بے پناہ، یا مردِ حکیم
یہ دو ہی خوشی سے جی سکتے ہیں

اور اس میں کیا شک ہے کہ وہ جب تک جیئے خوب جیئے، خوشی سے جیئے، مطمئن جیئے۔ انھوں نے زندگی کی ہر خوبصورت چیز سے پیار کیا۔ حق کے لیے جستجوئے مسلسل کی۔ اپنے ضمیر کے خلاف کبھی کچھ نہیں کیا۔ کسی سے حسد، کسی سے دشمنی نہیں کی۔ انھیں وہ قلب مطمئنہ حاصل تھا جو ذہنی مسرت کی بنیاد اور روحانی عظمت کا سرچشمہ ہے۔ جدید ادب میں جو کبھی کبھار مایوسی کا ایک مریضانہ عنصر ملتا ہے۔ اس کو دیکھ کر وہ اکثر حیران رہ جایا کرتے تھے کیوں کہ خود انھوں نے زندگی اور زندگی میں نیکی کی قوت پر اعتماد کبھی نہیں کھویا۔" (اللہ دے بندہ لے، ص171)

ان کے دیگر خاکوں میں "ایک یاد" کا ابراہیم، ایک کم عمر یتیم لڑکا زندگی کی تلخیوں سے جوجھتا ہوا تھوڑی سی تفریح کے ذریعے راحت و فرحت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ "تلی تال سے چینا مال تک" کا ڈانڈی چلانے والا مزدور زندگی کی حقیقتوں اور سماج کے دوہرے رویے سے واقفیت حاصل کر چکا ہے اور اس کا یہ خیال ہے کہ انسان جس کرب سے خود نہیں گزرتا اس کو سہی طور پر بیان بھی نہیں کر سکتا۔ "نیچ" کی شاملہ کی رام اوتار کے لیے محبت اس منزل پر پہنچ گئی ہے جہاں انسان اپنے بجائے دوسرے کی خوشی کو ترجیح دیتا ہے۔ ان خاکوں کے ذریعے مصنفہ نے ذات پات، اونچ نیچ جیسی تمام سماجی برائیوں پر کاری ضرب لگائی ہے۔ ان کی انسان دوستی، روشن خیالی، سماج میں مساوات قائم کرنے کی آرزومندی ان کے ترقی پسند خیالات کو ظاہر کرتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انسانیت اور اخلاق انسان کو بلند درجے پر رکھتے ہیں۔ عام کہے جانے والے انسانوں کو انھوں نے کیسے خاص پایا اور ایک عام اور معمولی انسان پر بھی خاکہ لکھنا کیوں ضروری ہے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

"یہ کیفیت مخصوص ان کرداروں میں ہوتی ہے جو دیکھنے میں اتنے اہم کبھی نہ لگے ہوں گے۔ نہ وہ کوئی بڑے شہنشاہ یا حاکم ہیں یا سیاست داں، نہ مصور، نہ شاعر، نہ ادیب! وہ زندگی کے وسیع صحرا کا ایک ذرہ ہیں۔ حیات کے بے پایاں سمندر کا ایک قطرہ ہیں۔ مگر یہ کون نہیں جانتا کہ ان قطروں کے بغیر نہ تو سمندر ہے اور نہ ان ذروں کے بغیر صحرا۔ یہ وہ چھوٹی چھوٹی حقیقتیں ہیں جن کو ملا کر زندگی کی عظیم حقیقت کا بے پایاں کینوس تیار ہوتا ہے۔"

(زرد گلاب، ص106-107)

رضیہ سجاد ظہیر کے خاکے مختصر مگر جامع ہیں۔ تاثراتی نوعیت ان خاکوں میں وہ شخصیت کے تمام پہلوؤں کو پیش کرنے کے بجائے کسی ایک نمایاں پہلو کو پیش کرتی ہے جو اس شخصیت کی پہچان بن جاتے ہیں۔

□□□

Dr. Bibi Raza Khatoon
Assistant Professor
Dept. of Urdu
MANUU
Hyderabad-500 032 (T.S)

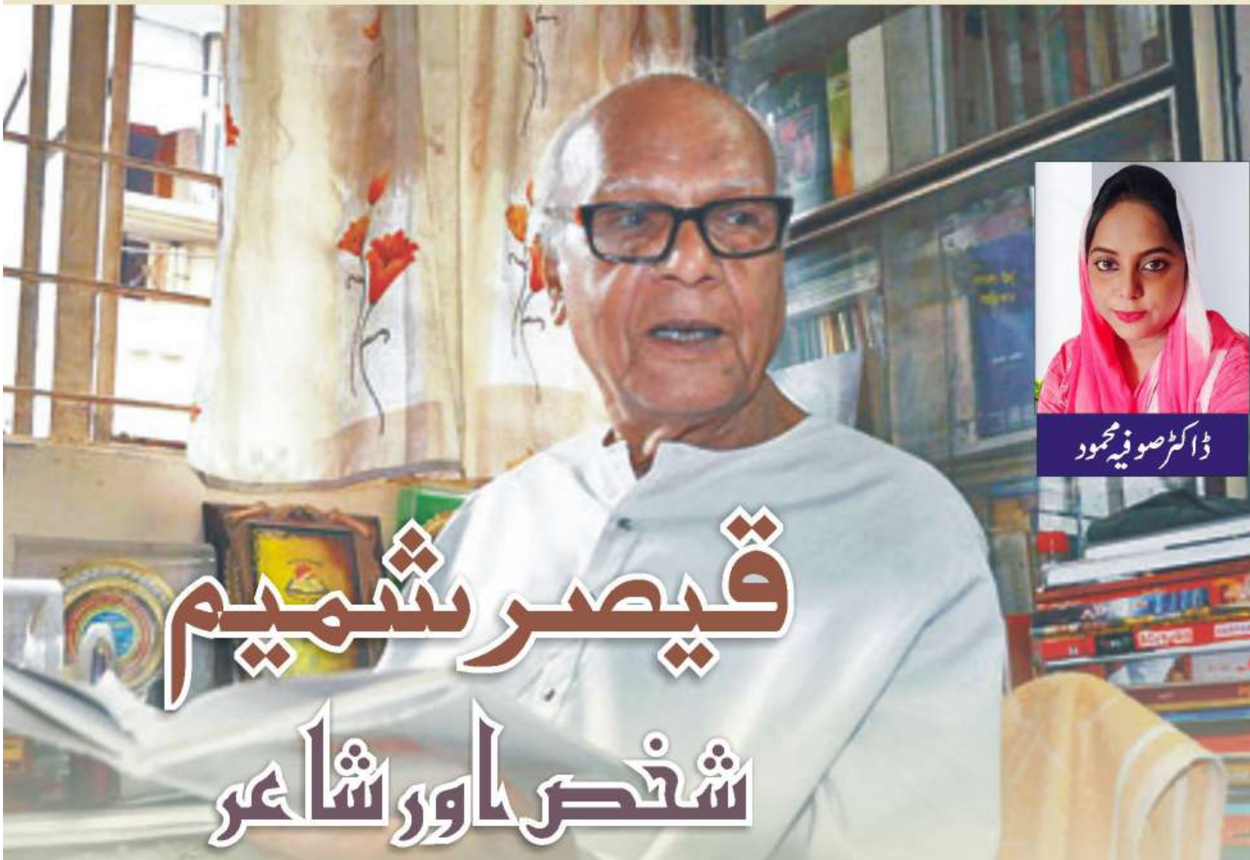

ڈاکٹر صوفیہ محمود

قیصر شمیم
شخص اور شاعر

سرزمین بنگال میں ضلع ہگلی کے انکس نامی محلے کے ایک غریب گھرانے میں تاریخ 2/اپریل 1936، ایک تابندہ ستارہ طلوع ہوا جسے اردو دنیا قیصر شمیم کے نام سے جانتی ہے جبکہ ان کا اصل نام عبدالقیوم خاں تھا۔ انھوں نے عمید انکسی کے نام سے اپنا ادبی سفر شروع کیا تھا۔ موصوف پانچ کتابوں کے خالق ہیں۔ انھوں نے کم وبیش تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی جن میں غزل، نظم، گیت، دوہا، رباعیات، قطعات، حمد، نعت، تضمین وغیرہ شامل ہیں وہیں دوسری طرف تنقیدی مضامین اور تراجم وغیرہ کو بھی انھوں نے اپنی توجہ کا مرکز بنایا جو ان کی اردو کے ساتھ ہی ساتھ دوسری زبانوں مثلاً بنگلہ، ہندی اور انگریزی پر مکمل دسترس کا ثبوت ہے۔

موصوف کے والد مرحوم جناب عبدالرحیم خاں ایک کارخانے میں ملازم تھے۔ قلیل آمدنی کے سبب قیصر شمیم کو کم عمری سے ہی چھوٹی موٹی ملازمت سے جڑنا پڑا۔ انھوں نے اپنے تعلیمی سفر کا آغاز انگلش بوائز پرائمری اسکول سے کیا اور اپنی ابتدائی تعلیم چاپدانی میونسپل پرائمری اسکول سے مکمل کی۔ 1946 کے فرقہ وارانہ فسادات کے زمانے میں آپ پریسی ڈنسی مسلم ہائی اسکول میں درجہ ششم کے طالب علم تھے۔ ناسازگار حالات کے سبب کچھ دنوں کے لیے تعلیم ترک کرنا پڑی پھر شیام نگر 24 پرگنہ کے گرولیہ ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ ابھی درجہ نہم ہی میں تھے کہ گھر کی مالی مشکلات کے سبب اسکول چھوڑنا پڑا اور بہ حالت مجبوری میں کلکتہ کے ایک چھوٹے سے مدرسے میں درس وتدریس کے پیشے سے منسلک ہو گئے۔ ملازمت سے جڑنے کے باوجود تعلیم سے قلبی لگاؤ ہمیشہ رہا چنانچہ 1952 میں ہگلی ہائی مدرسہ میں داخلہ لیا اور یہیں سے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے 1953 میں پاس ہی نہیں کیا بلکہ مغربی بنگال ہائی مدرسہ ایجوکیشن بورڈ میں دوسری پوزیشن حاصل کر کے ایک ریکارڈ بھی بنالیا۔ پھر مولانا آزاد کالج سے آئی۔ اے فرسٹ ڈویژن 1955 میں پاس کیا اور کلکتہ یونیورسٹی سے 1963 میں بی۔ اے اور 1965 میں ایم۔ اے (فرسٹ کلاس) کیا۔

بقول قیصر شمیم:

> ”مجھے یاد ہے کہ جوٹ مل کے جس علاقے میں میں پیدا ہوا تھا وہاں جی ٹی روڈ کے ایک طرف مزدوروں کی بستی تھی جس میں مرغیوں کے ڈربوں جیسے چھوٹے چھوٹے گھر تھے ان میں اکثریت بانس اور مٹی سے بنے ہوئے ایسے گھروں کی تھی جو بیشتر اوقات بوسیدہ رہا کرتے تھے۔ میاں بیوی، بیٹے بیٹیاں، پورا خاندان ایک ہی گھر میں ٹھسا پڑا رہتا تھا اور گھٹ گھٹ کر اسی طرح زندگی گزارتا تھا۔“

(پہاڑ کاٹتے ہوئے، قیصر شمیم، ص۔14)

قیصر شمیم ہوڑہ مسلم ہائی اسکول میں 1957 سے 1968 تک

بحیثیت استاد اپنے فرائض بخوبی انجام دینے کے بعد 16 /اپریل 1968 سے سی۔ایم۔او۔ ہائی اسکول کلکتہ میں درس و تدریس سے منسلک ہوگئے۔عارضی طور پرخضر پور کالج (ایوننگ) میں بحیثیت لیکچرار بھی رہے، موصوف مولانا آزاد کالج اور کلکتہ یونیورسٹی کی طرح عالیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بھی جزوقتی لیکچرر رہ چکے تھے۔

ان کی ادبی زندگی کا آغاز 1950 میں افسانہ نگاری سے ہوا لیکن انھیں شہرت بحیثیت شاعر نصیب ہوئی۔نظم وغزل دونوں اصناف پر انھیں عبور حاصل تھا۔ان کا رجحان ہمیشہ ترقی پسندانہ رہا۔مگر کچھ ہی عرصہ کے بعد ان پر'جدیدیت' کا رنگ بھی غالب آ گیا تھا۔قیصر شمیم صاحب کو بچپن ہی سے شعروشاعری کا شوق تھا۔شروع شروع میں انکس کی نسبت سے عمید انکسی کے قلمی نام سے لکھتے تھے لیکن 1957 کے بعد مظہر امام کے مشورے سے قیصر شمیم کے قلمی نام سے لکھنے لگے اور قیصر تخلص کیا۔

وہی پیاس کا منظر وہی لہو قیصر
ہنوز پھرتی ہے کوفے کی نہر آنکھوں میں

ان کی ابتدائی زندگی مشترکہ تہذیب و کلچر میں گزری جن کا ان کی شخصیت پر بھر پور اثر ہے۔ان کی شہرت ہندو پاک کے ساتھ ہی بنگلہ دیش تک پھیلی ہوئی ہے۔موصوف غزل،نظم،اور گیت پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔شاعری میں انھوں نے پہلے علامہ مہدی لکھنوی کے شاگرد مولوی شمس الہدیٰ مظفر پوری سے اصلاح لی پھر پروفیسر عباس علی بیخود سے مشورہ سخن کرنے لگے۔بعد از یونیورسٹی کے زمانے میں چند غزلوں پر پروفیسر پرویز شاہدی سے بھی مشورہ سخن لیا۔

موصوف کو اردو، ہندی،انگلش اور بنگلہ زبان میں دسترس حاصل تھی۔اس لیے ان کی نظموں میں گہرائی و گیرائی ملتی ہے۔نظموں کے عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ پیچیدہ موضوع سے لبریز ہیں۔ان کی نظمیں نہ ترقی پسندی سے انحراف کرتی ہیں اور نہ ہی جدیدیت سے، بلکہ دونوں کا ملا جلا امتزاج ان کی نظموں میں دیکھا جاتا ہے۔جیسے سجدہ، پہاڑ کٹنے تک، نئے کوہ کاف کی کھوج، زیر دیوار، مجھے چھوڑو، دردآنسو مسکان، مجھے دکھ ہے، بنتی کے دو بول، عید مناؤ، نیا سال، ایک سوال، سر راہے، یہ وہ سرزمیں ہے، ایمان، آدمی اور آئینہ، وہ شام، کیا تم پرچھائیں تھے، یہ سپنا کب پورا ہوگا، میرا ساتھ کہاں تک دوگے، مگر قدرشناسی، قلم کا سپاہی، ہمارے اپنے لہو کا حصہ، خودکشی کرنے والے کے نام، نیلسن منڈیلا کے نام، ایک صبح ملن، خلیج، آج کا انسان، آئینہ آب، تاش کے پتے، گمشدگی بے وجودی، انتظار، ایک دن اور ملا، امل کانتی وغیرہ اہم ہیں۔قیصر شمیم کی شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ پانچویں جماعت کے طالب علم تھے، کیسے ہوا؟اس کی تفصیل انھیں کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

''مجھے یاد ہے کہ 1946 میں جس دن سالانہ امتحان کے نتائج سنائے جانے والے تھے۔میں پانچویں جماعت کی حیثیت سے کلاس روم میں اپنے ہم سبق لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر ہیڈ ماسٹر صاحب کے آنے اور ان سے اپنا نتیجہ سننے کا انتظار کر رہا تھا جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا میری گھبراہٹ اور پریشانی بڑھتی جاتی تھی۔خوف تھا کہ ناکام ہونے پر گھر میں بہت سخت سزا ملے گی۔اسی عالم میں خاموشی کے ساتھ اللہ سے دعا کرنے لگا، یا اللہ مجھ پر رحم کر اس بار کسی طرح کامیاب کردے یا اللہ، کامیاب ہو جاؤں گا تو روزانہ قرآن کی تلاوت کروں گا، پنج گانہ نمازیں پڑھوں گا، رمضان میں روزے بھی رکھوں گا، یا اللہ اب جی لگا کر پڑھوں گا، پڑھنے سے جی نہیں چراؤں گا، صرف اس بار مجھے کامیاب کر دے اللہ۔میں اسی طرح دعا مانگنے میں کھویا ہوا تھا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کمرے میں آگئے چاروں طرف سناٹا چھا گیا اور نتائج سنائے جانے لگے، تھوڑی ہی دیر میں جب ہیڈ ماسٹر صاحب کی زبان سے میرے رول نمبر کے ساتھ پاس لفظ ادا ہوا تو بے حد خوشی ہوئی کہ اللہ نے میری سن لی لیکن اس کے بعد حیرت کے ساتھ خوشی کی ایک دوسری لہر میرے دل میں پیدا ہوئی، میں نے دیکھا کہ ڈسک پر میری کاپی کھلی پڑی تھی، جس پر پنسل سے ایک نظم کی صورت میں وہی تمام باتیں درج تھیں جو میں دل ہی دل میں اللہ سے دعا کرتے ہوئے کہہ چکا تھا۔اسے دیکھ کر مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں شاعری کر سکتا ہوں۔کاش وہ نظم میرے پاس محفوظ ہوتی تو اسے اشاعت کے لیے کہیں نہ کہیں ضرور دیتا کہ وہ نظم جیسی بھی تھی میری نظم نگاری کا نقطہ آغاز تھی۔''

(پہاڑ کاٹتے ہوئے، قیصر شمیم، ص۔13-14)

قیصر شمیم کی پوری عمر مغربی بنگال کی سرزمین پر اردو ادب بالخصوص شاعری کی ریاضت میں گزری ہے۔ان کی تحریر کردہ کتابوں میں ساعتوں کا سمندر (1971)، تری دھارا (1994)، سانس کی دھار (1997)، پہاڑ کاٹتے ہوئے (1998) اور زمین چیختی ہے (2021) اہمیت کی حامل ہیں۔یہ صرف قیصر شمیم کے شعری مجموعے ہی نہیں بلکہ ایک شاعر کی زندگی

کی روداد ہیں۔ان کا شمار دورِ جدید کے ان شعراء میں ہوتا ہے جو قاری کو فکر و عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ان کی شاعری نئی نسل کے لیے مشعلِ راہ ہے جو گہرائی و گیرائی سے مزین ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں ذات کے علاوہ سماج و معاشرہ اور کائنات کے اسرار و رموز سے بھی اپنا رشتہ استوار کیا ہے موصوف اپنی شاعری کے متعلق کچھ اس طرح کا خیال رکھتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

''میری شاعری نہ آباؤاجداد کا ورثہ ہے نہ استاد کا عطیہ ،شاعری میرا پیشہ بھی نہیں ہے اور سنڈے پینٹرز کی اتوار کا مشغلہ بھی نہیں میرے نزدیک شاعری 'ساعتوں کے سمندر' میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے ہاتھ پاؤں مارتے رہنے کے عمل سے ملتا جلتا ایک عمل ہے لیکن سخت تر اور لطیف۔''

(ساعتوں کا سمندر، قیصر شمیم، ص۔6)

قیصر شمیم کا پہلا شعری مجموعہ 'ساعتوں کا سمندر' 1971 میں اردو اور دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوا تھا۔اس میں غزلوں کے ساتھ سولہ نظمیں بھی ہیں۔'ساعتوں کا سمندر' میں نظموں کی ایک مخصوص فضا ہے۔مصنف نے ان نظموں میں ایمائیت کے پہلو بہ پہلو اپنی آواز کی صداقت کو بلند آہنگ عطا کیا ہے۔

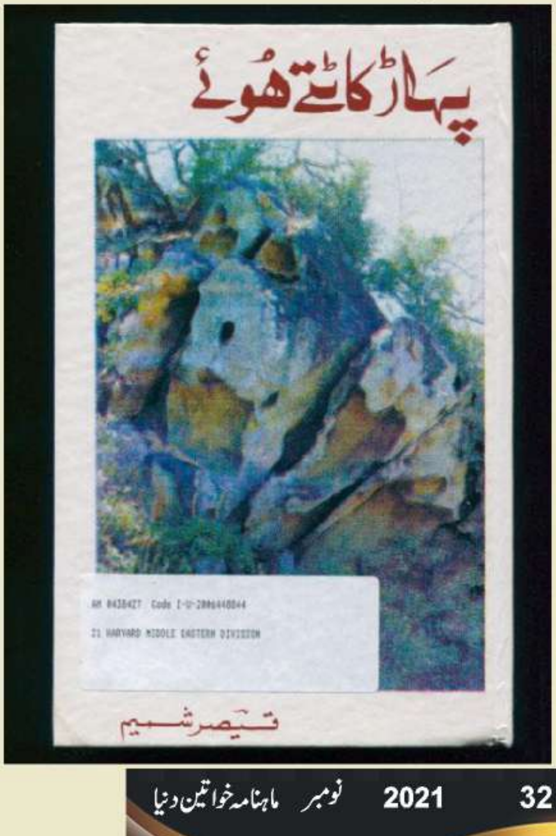

قیصر شمیم کا دوسرا شعری مجموعہ 'تری دھارا' ہے جو دیوناگری رسم الخط میں (1994) ڈاکٹر ہزی کنور کی وساطت سے منظر عام پر آیا اس میں 45 نظموں کے علاوہ گیت اور غزلیں بھی شامل ہیں۔ان نظموں اور گیتوں کا معیار اعلی ہے، یہ گیت نہ صرف موسیقی ریز اور فکر آسا ہیں بلکہ شاعری کی دردمندی ہر لفظ میں نگینے کی طرح جڑی ہوئی ہے۔گیت کے یہ ٹکڑے دیکھیں:

کیسے عید مناؤں ساجن
کیسے عید مناؤں
ساتھ تمھارا چھوٹ گیا ہے
بن کے قسمت بگڑ گئی ہے
میری دنیا اجڑ گئی ہے
اب روؤں یا گاؤں ساجن
کیسے عید مناؤں

(پہاڑ کاٹتے ہوئے، قیصر شمیم، ص۔155)

'سانس کی دھار' قیصر شمیم کا تیسرا شعری مجموعہ ہے جو 1997 میں منظر عام پر آیا، یہ مجموعہ اردو رسم الخط میں ہے۔'سانس کی دھار' موصوف کا ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جس کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف شاعری کے تمام فن وعلوم سے واقفیت رکھتے ہیں۔ایک اہم اور بڑے شاعر کے تمام امکانات ان کے یہاں موجود ہیں۔'سانس کی دھار' میں ایک سو غزلیں ہیں جن کا انتخاب 1951 سے 1996 تک کے کلام سے دستیاب کیا گیا ہے، یعنی مصنف نے اپنے تخلیقی سفر کی مختلف روداد کو غزل کے پیرایے میں سمو دیا ہے۔اس میں ان کے تجربات، حیات و کائنات کے معاملات اور ان کے قلبی واردات کی داستان ان کی غزل کی مبادیات ہیں۔ان کی شاعری میں نبض زیست کی دھڑکنیں ہیں، جذبات میں خلوص اور بیان میں سنجیدگی ہے ان کی شاعری ان کی شخصیت کی غماز ہے۔

قیصر شمیم ادب کے اس روشن و تابندہ ستارے کا نام ہے جو آسمان ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ان کا شمار بین الاقوامی سطح پر ہوتا ہے۔ملک کے بیشتر رسائل و جرائد کے علاوہ بیرونی مما لک میں بھی ان کا کلام شائع ہوتا رہا ہے ۔2006 انجمن اردو فروغ برطانیہ لندن میں موصوف کو بطور مہمان خصوصی مدعو کیا گیا تھا۔ڈاکٹر شارب ردولوی کی کتاب 'گل صد رنگ' میں ملک کے پانچ سو شعراء کی غزلوں میں موصوف کی بھی دو غزلیں شامل ہیں۔ایودھیا گوئل کی کتاب 'نئے موڑ' میں بھی موصوف کی دو غزلیں شامل ہیں۔اس کے علاوہ ماہنامہ 'تحریک' سے شائع شدہ شاعری کا انتخاب 'شہزادہ' میں بھی ان کا کلام شامل ہے۔جمشید پور سے

شائع ہونے والے 'انتھالوجی گلوب' میں مع تعارف ان کی غزلیں شامل ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر مظفر حنفی مرحوم کی غزلوں کا انتخاب 'روح غزل' میں بھی قیصر شمیم کی غزلیں شامل ہیں۔

قیصر شمیم متعدد اعزازات و انعام سے بھی نوازے جا چکے ہیں: جن میں مغربی بنگال اردو اکیڈمی کا مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایوارڈ (1996)، بنگلہ رسالہ 'ابھینو اگرنی' سنیہہ لتا چودھری میڈل (1997)، 'سانس کی دھار' پر مغربی بنگال اردو اکیڈمی کا انعام (1997)، 'پہاڑ کاٹتے ہوئے' پر مغربی بنگال اردو اکیڈمی کا انعام (1998)، بھارتیہ بھاشا پریشد کلکتہ کا سلور جبلی اعزاز (1999) وغیرہ اہم ہے۔

ہوں آپ زمانے میں سرفراز زیادہ
اللہ کرے اور بھی اعزاز زیادہ

قیصر شمیم کا افسانوی سفر 1951 سے 1960 پر محیط ہے۔ ابتدائی دنوں میں انھوں نے رومانی افسانے لکھے لیکن بعد کے افسانے معاشرتی اور نفسیاتی نوعیت سے لبریز تھے۔ ان کا پہلا افسانہ 'وہ لڑکی' کے عنوان سے 1951 میں دہلی کے ہفتہ وار 'پارس' میں شائع ہوا تھا۔ ماہنامہ 'صبح نو' میں بھی ان کے افسانے 'ٹوٹ گئی پتوار' اور 'دھندلے آئینے' شائع ہوئے تھے۔ ان کا افسانہ ''بز'' اتنا مشہور ہوا کہ ماہنامہ 'پگڈنڈی' امرتسر، صبح نو کے علاوہ دو ماہی 'چراغ راہ' میں بھی شائع ہوا۔

قیصر شمیم بحیثیت مترجم بھی اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے بنگلہ، ہندی، اور انگریزی زبان سے ادب کے قیمتی اثاثوں کو اتنی آسان اور سہل زبان میں اردو میں منتقل کیا ہے کہ ترجمہ کے بجائے ان کی تصانیف معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے ترجمہ شدہ مضامین روزنامہ 'آبشار'، ماہنامہ 'نکہت' (الہ آباد)، آج کل (دہلی)، پگڈنڈی (امرتسر)، اجالا (کلکتہ)، اور انگریزی ہفت روزہ (Struggle) وغیرہ میں تسلسل کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں۔ بحیثیت مترجم انھوں نے ''آزاد ہند''، 'اقدار'، اور ''ہوڑہ ٹائمز'' وغیرہ اخبارات میں بھی اپنے صحافتی فرائض انجام دیئے تھے۔ قیصر شمیم صاحب کی شاعری ان کی روح کے کرب و تذبذب کی ترجمانی کرتی ہے جس کا بخوبی اندازہ ان کے درج ذیل شعر سے کیا جاسکتا ہے ملاحظہ فرمائیں:

مرے قلم سے ٹپکتا ہے میرے دل کا لہو
مری نگاہ میں ہیں ماہ و سال کے پیکر

جناب قیصر شمیم ایک خوش مزاج، ملنسار انسان دوست اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ اس ناچیز کو ادبی محفلوں میں ان سے ملنے کا موقع میسر ہوا، موصوف ہمیشہ نیک مشوروں سے نوازتے تھے۔ ان کے گزر جانے سے سرزمین بنگالہ کی ادبی محفلوں میں اداسی طاری ہوگئی ہے۔ ادب سے ان کی بے لوث محبت، ان کی ادبی کاوشیں ہمیشہ ہم سب کے دلوں میں زندہ و پابندہ رہیں گی اور ادب کے طالب علموں کو ان کی ادبی کاوشیں ہمیشہ فیض یاب کرتی رہیں گی۔ قیصر شمیم کی ذات ارض بنگالہ کی آبرو ہے جو علم و ادب کے چراغوں کو ہمیشہ روشن کرتی رہے گی۔

کتابیات

1۔ ساعتوں کا سمندر، قیصر شمیم، سپرنا پبلی کیشنز، شیب پور ہوڑہ، 1971
2۔ تری دھارا، قیصر شمیم، سپرنا پبلی کیشنز، شیب پور ہوڑہ، 1994
3۔ سانس کی دھار، قیصر شمیم، عرفان گرافکس، شیب پور ہوڑہ، 1997
4۔ پہاڑ کاٹتے ہوئے، قیصر شمیم، عرفان گرافکس، شیب پور ہوڑہ، 1998
5۔ اور زمین چیختی ہے، قیصر شمیم، عرفان گرافکس، شیب پور ہوڑہ، 2021

□□□

Ms. Sufia Mahmood
Research Scholar
Dept. of Arabic, Persian, Urdu
Bhasha Bhawan
Vishwabharti University
Shantiniketan-731235 (W.B)

عبدالماجد دریابادی کی صحافت نگاری

سلیقہ جان

مولانا عبدالماجد دریا بادی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے تنقید، تفسیر، ترجمہ اور شاعری کے ساتھ ساتھ صحافت کے میدان میں بھی ایک خاص مقام بنایا۔ مولانا ایک بے باک صحافی تھے انھوں نے بلا کسی ڈر کے حقائق کی پاسداری کی جس کی وجہ سے اُن کو بہت سی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ انھوں نے اس سلسلے میں بہت لڑائیاں بھی لڑی۔ وہ صحافت کے اصولوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ اُن کی صحافت نگاری بے لوث اور با مقصد تھی۔ تحسین فراقی صاحب ان کی صحافت نگاری کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں:

> ''ماجد کی شخصیت جس صداقت سے عبارت تھی اس کا اظہار ان کے ادب وانشاء اوران کی دینی تحریروں کے علاوہ ان کی صحافت میں بھی اس بے باکی سے نمایاں ہوا کہ تقسیم کے بعد کے ہندوستان میں بلاشائبۂ تردید کہا جاسکتا ہے کہ ان جیسا قلم اور ان جیسا دبنگ لہجہ کسی دوسرے مسلم قلم کار یا صحافی کو نصیب نہ ہوا۔ صحافت ان کے لیے عبادت تھی اور ان کے عبد وعاجز ہونے میں کیا کلام ہے؟''

(ڈاکٹر تحسین فراقی، مولانا عبدالماجد دریابادی، احوال وآثار، ص:661)

عبدالماجد دریا بادی نے اپنی صحافتی زندگی کی شروعات تب کی جب وہ صرف بارہ برس کے تھے۔ اودھ اخبار کے ایک مراسلے سے انھوں نے شروعات کی۔ عبدالماجد کی تحریریں تقریباً ایک درجن سے زیادہ روزناموں، ہفتہ واراخبارات اور رسائل میں چھپتی تھیں۔ اُردو کے علاوہ انگریزی اخبارات ورسائل میں بھی اِن کی تحریریں شائع ہوتی تھی مثلاً انڈین ڈیلی ٹیلی گراف، ایڈوکیٹ (لکھنؤ) نیچر (لندن) ایسٹ اینڈ ویسٹ (بمبئی) ماڈرن ریویو (کلکتہ) وغیرہ وغیرہ۔

امرتسر سے دو مشہور اخبار ''ضیاء اسلام'' اور ''وکیل'' نکلتے تھے۔ وکیل میں ان کے دو مضامین ''محمد غزنوی'' اور ''غذائے انسانی'' شائع ہوئے۔ فلسفے کے ساتھ ان کو خاص دلچسپی تھی۔ انھوں نے مغربی فلسفیوں کی تنقید بھی کی۔ علامہ شبلی کی مشہور کتاب ''الکلام'' کی تنقید ''طالب علم'' کے نام سے ماہنامہ ''الناظر'' میں قسطوں میں شائع ہوتی رہی۔ مشہور روزنامہ ''ہمدم'' صحافی سید جالب دہلوی کی ادارت میں لکھنؤ سے نکلتا تھا۔ عبدالماجد کی شہرت اُس وقت تک ایک صحافی کی حیثیت سے ہوگئی تھی۔ ''ہمدم'' کے ایڈیٹر نے پہلی اشاعت کے لے ان سے طویل مضمون مانگا، اور اس کو شائع کیا، اس کے بعد ماہ نامہ ''معارف'' میں کثرت سے نوٹ، تبصرہ اور ترجمے بھی کرتے رہے۔

1919 میں عبدالماجد نے ''معارف'' میں مستقل شذرہ نگاری کا آغاز کیا۔ یہ شذرات اُن کی ''سچی باتیں'' جو سچ، صدق اور صدق جدید کا مستقل کالم ہوا کرتا تھا، جس سے ہندوپاک کے بیشتر اخبارات اور رسائل

نقل کرتے تھے۔اس کے بعد محمد علی جوہر کا اخبار ''ہمدرد'' دہلی سے نکلنا شروع ہوا۔مولانا کے اصرار پر عبدالماجد نے اس کے انتظامی اُمور میں حصہ لینا شروع کیا۔مولانا کے قلم سے کئی مضامین ''ہمدرد میں شائع ہوتے رہے۔شیر کی گرج،نہرو رپوٹ خاص طور پر مقبول ہوئے۔''ہمدرد'' اور ''حقیقت'' کی نگرانی بھی کی ۔پھر اپنے تین ہفتہ وار اخبار نکالے جن کا تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

سچ : جنوری 1925 میں مولانا عبدالماجد دریا بادی نے باقاعدہ طور پر اپنی صحافتی زندگی کی شروعات کی۔''الناظر'' کے ایڈیٹر ظفر الملک علوی کے ساتھ ان کا دوستی کا رشتہ تھا،دونوں نے مل کر ہفتہ وار ''سچ'' کا پہلا شمارہ جنوری 1925 میں شائع کیا۔پہلے سچ کے ایڈیٹر ظفر الملک تھے۔ اگست 1925 میں ظفر الملک اس کے منیجر اور عبدالماجد دریابادی اس کے ایڈیٹر بن گئے۔

''سچ''ایک قوم پرست اخبار تھا۔اس اخبار نے ہمیشہ تحریکِ آزادی کی حمایت کی۔اس اخبار میں اُن سارے جملوں کا جواب دیا جاتا جو اسلام کے خلاف بولے جاتے تھے،مغربی تہذیب کے مضر اثرات و رجحانات سے بچنے کی مسلمانوں کو تلقین بھی کی جاتی تھی۔''سچ'' میں ایک خاص کالم ''سچی باتیں'' کے نام سے لکھا جاتا تھا۔جس میں شدید قسم کا طنز ہوتا تھا،دوسرے کئی اخبار نے اس عنوان کی نقل کی۔تحسین فراقی ''سچ'' کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں:

> ''سچ''،کو اپنی زندگی میں بڑی بڑی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ اصلاحِ معاشرہ،ردِّ بدعات،تجدید اور ترقی پسندی کی مخالفت اس کے چند خاص موضوعات تھے۔فتنۂ انکارِ حدیث کا مقابلہ بھی اس پرچے نے خوب کیا۔''

(ڈاکٹر تحسین فراقی،مولانا عبدالماجد دریابادی،احوال وآثار،ص 669)

''سچ'' کے بیشتر مشمولات عبدالماجد خود لکھا کرتے تھے۔اس میں حالات حاضرہ کے ساتھ ساتھ مسائل پر بھی تبصرے ہوا کرتے تھے۔ان اخبارات کی سُرخیاں دلچسپ اور جاذبِ نظر ہوتی تھی۔اہلِ علم کے مقالے اور مراسلے بھی شائع ہوتے تھے۔اس نے تعلیم یافتہ لوگوں کے دلوں میں مغربی تہذیب وتمدن کی سطحیت ،بے وقعتی اور تحقیر پیدا کی ۔جس سے قومی تحریکات اور ملی مفادات کو بڑا فائدہ ہوا اور یہ اخبار برطانوی حکومت کی نظروں میں کھٹکتے تھے جس وجہ سے جولائی 1930 میں بعض مضامین کی اشاعت پر یوپی حکومت نے ''سچ'' سے ضمانت طلب کی ،اور تقریباً چار مہینے تک اس کی اشاعت موقوف رہی۔نومبر 1930 میں اس کی دوبارہ اشاعت شروع ہوئی۔

''سچ'' میں جہاں مغربی تہذیب وتمدن کے بُرے اثرات دکھائے گئے وہیں انشائے ماجدی کی دلآویزی اور مذہب اسلام کی صحیح تعلیم،وطن پرستی کے علاوہ تعصّبات،ترجیحات اور ذاتی پسند و ناپسند سے اوپر اُٹھ کر حقائق وانصاف کے ساتھ مناقشوں اور مباحثوں کو شائع کیا جاتا تھا۔''سچ'' کے متعلق عبدالعلیم قدوائی اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

> ''سچ میں انشاء ماجدی کی دلآویزی کے ساتھ صحیح مذہب،وطن دوستی اور علم واخلاق کی مستند قدریں ملتی ہیں۔اس پرچے نے اردو صحافت میں حق گوئی،علم دوستی اور حقیقی تنقید کی نظر قائم کی۔سلیس و عام فہم عبارت،بلیغ وبرجستہ سُرخیوں اور مصرعوں کے استعمال سے اس کا علمی واونچا رتبہ بہت بلند ہوگیا تھا۔اس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ولایتی اخبارات ورسائل اور مذہبی وعلمی کتابوں سے اخذ کردہ صحیح معلومات پڑھنے والوں کو فراہم کی جاتی تھیں اور ذاتیات وشخصیات سے الگ رہ کر انصاف وتوازن سے مباحثوں اور مجادلات میں حصہ لیا جاتا تھا۔''

(عبدالعلیم قدوائی،مولانا عبدالماجد دریابادی حیات وخدمات،ص 152)

جس زمانے میں ''سچ'' کا اجرا ہوا، اُس وقت مسلم قوم تعلیمی و اخلاقی اعتبار سے پسماندگی کا شکار تھی۔عورتوں کے شرعی حصہ دینے، عقد بیوگان اور شادی بیاہ فاتحہ وغیرہ میں فضول رسومات کا عمل جاری تھا۔ ''سچ'' میں ان خرابیوں کے خلاف آواز بلند کی گئی،اور مسلمانوں کو صحیح راستہ دکھانے کی کوشش کی گئی ۔ سچی باتیں کا ایک اقتباس اس طرح ہے:

> ''اسراف کے پہلو کو چھوڑ کر بھی دیکھیے،تو کسی حیثیت سے ان رسموں کو آپ مفید پائیں گے؟ سرمایا کی فراہمی میں کس قدر دقتیں اُٹھانی پڑتی ہیں،کتنا ضروری کاموں کا ہرج ہوتا ہے،خواہ مخواہ قرض لینا پڑتا ہے،گھر کی جائیداد خطرہ میں پڑتی ہے،سودی دستاویز لکھ کر خُدا کی سخت ترین نافرمانی کا عذاب مول لینا پڑتا ہے اور ان تمام زحمتوں اور گناہوں کے باوجود مہمان اور اہل برادری پھر بھی خوش نہیں ہوتے۔کوئی صاحب کھانے میں نقص نکالتے ہیں،کسی کو کپڑے زیور کی کمی پر اعتراض ہوتا ہے،کوئی صاحب بدانتظامی پر اعتراض کرتے ہیں۔'' نقصان مایہ'' تو پوری طرح ہوتا ہی ہے ساتھ ہی ''شماتت ہمسایہ'' کا پورا حصہ مل جاتا ہے۔کیا ایسی شادیاں

کبھی آئندہ چل کر باعث برکت ثابت ہوسکتی ہیں۔"

(نعیم الرحمٰن صدیقی، مرتب سچی باتیں، جلد اول، ص:34)

نیاز فتح پوری نے اپنے رسالہ "نگار" میں مذہب، آخرت یہاں تک کہ ذات باری تعالیٰ پر بھی نازیبا حملے کیے، مسلمانوں کے اعتقاد کا مذاق اُڑایا تھا۔ مولانا نے "سچ" میں اس کی زبردست گرفت کی، 1931 میں انھوں نے "سچ" میں ایک طویل مضمون "ایک دشمن اسلام" کے عنوان سے لکھا اور پورے ملک کے مسلمانوں کو اس مذموم حرکت کے خلاف بیدار کیا اور اس حرکت پر پورے ملک کے مسلمانوں نے ایک ہو کر احتجاجی مظاہرے کیے۔ آخر کار نیاز فتح پوری کو معافی نامہ داخل کرانا پڑا۔ 1932 میں ترقی پسند مصنفین نے انگارے کے نام سے افسانوی مجموعے کی اشاعت کی۔ جس میں فحش الفاظ استعمال کیے گئے تھے۔ اس میں ذات باری، فرشتوں اور مذہب کی شان میں گستاخی کی گئی تھی۔ 1933 میں مولانا عبدالماجد نے "سچ" میں اس کتاب کے بارے میں ایک مضمون لکھا اور اس کتاب کا عنوان "ایک شرم ناک کتاب" رکھا۔ دوسرے اخبارات جیسے خلافت، معارف اور سرفراز وغیرہ نے بھی پھر اس کتاب کے خلاف لکھنا شروع کیا۔

صدق: مئی 1935 میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے "صدق" لکھنؤ سے نکالا۔ شروع میں عبدالرؤف عباسی اس کے منیجر تھے اور مولانا ماجد بدستور ایڈیٹر رہے۔ بعد میں مولانا کے بڑے بھتیجے اور داماد حکیم حافظ عبدالقوی اس کے مستقل منیجر بن گئے۔

مشمولات اور سائز میں "صدق"، "سچ" کا نقش ثانی اور نعم البدل تھا، مگر "صدق" میں چند سالوں کے بعد تفسیر قرآن کے کالم کے ساتھ ساتھ مشورے و گزارش کے کالم کا اضافہ بھی کیا گیا۔ اس کالم میں مختلف قسم کے سوالات کا جواب اور مسائل کے حل پیش کیے جاتے تھے۔ مولانا کو اس کالم سے دلچسپی تھی عالموں اور ادیبوں کے مضامین بھی شائع ہوتے رہتے جیسے سید سلمان ندوی، مناظر احسن گیلانی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ۔

"صدق" کو بھی سچ کی طرح کئی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن مولانا نے کبھی سچ کا دامن نہیں چھوڑا جس کی بدولت بہت سے مخالفین بھی پیدا ہو گئے۔ مولانا کے مخالف بعض اخبار و رسائل بھی رہے۔ خاص طور پر حیات اللہ انصاری (مدیر) نے "قومی آواز" میں مولانا پر اور صدق پر یہ الزام لگایا کہ مولانا دو قومی نظریہ اور مسلم لیگ کے حامی ہیں اور ہندوستان کے بدخواہ۔ مولانا عبدلماجد نے ان اختلافات کو بھی ذاتی دشمنی کا رنگ نہیں دیا بلکہ ان سے دوستانہ تعلق برابر قائم رکھا۔

مولانا عبدالماجد نے "صدق" میں نئی طبع شدہ مذہبی، ادبی کتابوں پر تبصرے "نئی کتابوں" کے عنوان سے شائع کیے۔ مولانا کے یہ تبصرے علمی، ادبی، مذہبی اور تنقیدی اعتبار سے اہم ہوتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ریڈیائی نشریے بھی شائع ہوتے تھے اس اخبار میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ندوۃ العلماء، دارالمصنفین اعظم گڑھ، انجمن ترقی اردو وغیرہ کے بارے میں اطلاعات اور ان کمیٹیوں کا حال شائع کیا جاتا تھا۔ اس میں اشتہارات سفر حج کے علاوہ دینی کتابوں پر تبصرے بھی ہوتے تھے۔

ایڈیٹر: عبدالماجد

صدق

نمبر ۳۳ | لکھنؤ - ۸ - محرم الحرام ۱۳۵۵ھ مطابق یکم اپریل ۱۹۳۶ء | جلد ۱

سچی باتیں

زبان و بیان، لغت و قواعد، فلسفہ وغیرہ سے مولانا کو خاص دلچسپی تھی۔ انھوں نے مولوی عبدالحق کی مرتب کردہ انگلش اردو لغت کے علاوہ دوسری علمی و ادبی کارنامے انسائکلو پیڈیا جیسی اہم تصانیف کے تعارف کے علاوہ تبصرے بھی "صدق" میں پیش کیے۔ "صدق" کی مالی حالت اگرچہ پہلے سے ہی کمزور رہی لیکن ملک کی تقسیم کے ساتھ ہی اس کے خریداروں کی تعداد بھی کم ہو گئی۔ پاکستان کی مالی بندش کی وجہ سے "صدق" کا مالی ربط بھی ٹوٹ گیا۔ کاغذ، چھپائی کمتر ہونے کے ساتھ ساتھ پریس کی خرابی کی وجہ سے پرچے کو خاصی دشواری کا سامنا رہا۔ حضرات مالی

امداد بھی کرتے رہے۔خریداروں کے اضافے کی مہم چلائی گئی، مالی تعاون کی اپیل بھی جاری کی گئی، مگر کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔

عبدالرؤف عباسی نے جب دیکھا کہ اخبار کو مالی دشواری کا سامنا ہے تو انھوں نے بڑھتے ہوئے نقصانات کے تحت پرچہ جاری رکھنے سے معذرت کی۔ اِس دوران مولانا عبدالماجد کو یہ خیال آیا کہ پرچہ کو اس مرتبہ براہِ راست ذاتی انتظام و انصرام میں شائع کیا جائے۔اس سلسلے میں انتظامی امور کی ذمہ داری مولانا کے بڑے بھتیجے اور داماد حکیم عبدالقوی دریابادی کو دی گئی انھیں منیجر اور نائب مدیر دونوں مقرر کیا گیا۔ اخبار کی تیاری، چھپائی، روانگی اور دفتری کاموں کی ذمہ داری محمد معین اور حساب کتاب کی ذمہ داری علی احمد سندیلوی کو دی گئی۔ پرچے کے نام کا سوال پھر سے پیدا ہو گیا۔ظفر الملک کی طرح اس مرتبہ مہتمم عبدالرؤف عباسی نے ''صدق'' نام کو اپنی ملکیت بتایا اور کوئی بھی دستاویز یا رجسٹر دینے سے انکار کیا۔مولانا اس کے بارے میں ''آپ بیتی'' میں یوں لکھتے ہیں:

> ''نئے پرچے کے نام کا سوال قانونی حیثیت سے پھر پیدا ہوا،اور اب مہتمم صاحب صدق کے نام کو اپنی ملکیت بتایا،مجبوراً ضابط کا نام صدق ''جدید'' رکھنا پڑا اور پہلا پرچہ چند ہی ہفتہ کے اندر شروع دسمبر 50ء میں نکل گیا۔دفتر سابق سے کاغذ وغیرہ کسی قسم کی کوئی چیز نہ ملی۔''

(مولانا عبدالماجد دریابادی، آپ بیتی، ص:225-224)

رسالہ ''صدق'' کی عمر ''سچ'' کے مقابلے میں کافی طویل رہی، 1950 تک وہ شائع ہوتا رہا۔

صدق جدید: مولانا عبدالماجد دریابادی نے 1950 میں ''صدق جدید'' کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔ملک کی آزادی کے بعد اردو صحافت میں ''صدق جدید'' نے ایک منفرد مقام بنا لیا۔عوام وخواص دونوں میں یہ اخبار بڑا مقبول ہوا۔اس کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ مولانا کی انشاپردازی ،اسلوب نگارش ،طنز وظرافت،شگفتہ نگاری اور رعایت لفظی وغیرہ تھی۔مولانا عبدالماجد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بقاء وتحفظ تعمیری واصطلاحی ادب، ہندو مسلم یکجہتی، مسلمانوں کے اتفاق کے لیے ایک سچے اور با اصول صحافی کی طرح جدوجہد کرتے رہے۔ ''صدق جدید'' کا سب سے اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے مجبور، محکوم، مسلم اقلیت اور اردو زبان ادب اور مشرقی تہذیب واقدار کی ترجمانی کے علاوہ تحفظ کا فریضہ بخوبی ادا کیا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کو اردو زبان سے بہت لگاؤ تھا۔ جو لوگ اُردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھ کر اس پر اُنگلی اُٹھاتے تھے، مولانا نے ان کو ''صدق جدید'' میں راہ راست پر لانے کے لیے کئی تحریریں ''سچی باتیں'' کے کالم میں شائع کی۔ جس میں اُنھوں نے اس بات پر زور دیا کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں بلکہ ہندوستان کی زبان ہے، اور یہ ملی جلی تہذیب وتمدن اور ہندو مسلم اتحاد کی نشانی ہے۔ یوپی میں جب اُردو اکیڈمی کی بنیاد پڑی تو مولانا نے حکومت کے اس فیصلے کو ''صدق جدید'' میں کافی سراہا اور ابتدا میں اکیڈمی میں ایک رکن کی حیثیت سے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوئے۔

''صدق جدید'' کثرت سے خریدا گیا۔ اس کے خریدنے والے تو زیادہ ظاہر ہے مسلمان ہی تھے مگر ہندو بھی خریدار تھے۔ ملک اور بیرون ملک کے رسالوں اور اخباروں کی طرف سے مولانا کو مضمون لکھنے کی فرمائش آتی رہتی۔ پرچہ کی ارادی ،شعوری ،دانستہ کوشش ہر دور میں دین کو بلند کرنے کی رہی۔ مولانا اپنے اخبار کی پیشانی پر جس آیت کو نقل کیا کرتے تھے یہی آیت ان کی زندگی کا نصب العین قرار پائی تھی۔ مولانا پوری زندگی سچ کو سچ ہی کہتے رہے۔ انھوں نے خود کہا صحافت تجارت نہیں عبادت ہے خود یہ بھی کہا ہے کہ سچائی اور دیانت داری کے راستے میں بڑی مشکلات کا سامنا ہے۔ انھوں نے صحافت کو اصلاح اور تعمیری وترقی کا ذریعہ تصور کیا، قلم کا استعمال ایمانداری سے کیا۔

مخصوص اسلوب اور منفرد تحریر انداز کے علاوہ ان کے اخبار کی سُرخیاں بھی بڑی دلچسپ اور پُرکشش ہوتی تھیں چند سُرخیاں اس طرح ہے، ہاتھ نکلے اپنے دونوں کام کے، کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے، کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے، اس کافر کی ادا یاد آئی۔ سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں، کیا یہ نمرود کی خدائی ہے وغیرہ وغیرہ۔

مولانا عبدالماجد دریابادی بے باک تھے اُن کی شخصیت کا خاص پہلو یہ تھا کہ وہ حقائق کو بیان کرنے میں دوست اور دشمن کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ''سچ'' کا ساتھ دیتے تھے۔ مولانا نے ہمیشہ اپنا قلم سچائی، دوسروں کی بھلائی اور قوم کی بیداری کے لیے اُٹھایا۔ ''سچ'' سے ''صدق جدید'' تک پہنچتے پہنچتے ان کا صحافتی قلم درجہ کمال تک پہنچ چکا تھا۔

□□□

Ms. Saleeta Jaan
Safapura
Gandarbal-193504(J & K)
saleeta121@gmail.com

شاعرات کے منتخب اشعار

دل نے وہ رنج اٹھائے ہیں تغافل میں ترے
اب ترے لطف و عنایات سے جی ڈرتا ہے

تمھاری یاد کی خوشبو سے مہکی شام فراق
ستارے درد کے چمکے مہِ تمام کے ساتھ

ممتاز مرزا

اب حلقۂ گرداب ہی آغوش سکوں ہے
ساحل سے بہت دور ڈبوئے ہیں سفینے

ماضی کے مزاروں کی طرف سوچ کے بڑھنا
ہو جاؤگے مایوس نہ کھو دو یہ دفینے

زاہدہ زیدی

جادۂ درد کے حالات مرے اپنے ہیں
راہ کے سارے طلسمات مرے اپنے ہیں

جن کی بنیاد ہوئی میرے لہو سے تعمیر
یہ گھروندے وہ محلات مرے اپنے ہیں

رشیدہ عیاں

نہ فرش خاک پہ ٹھہریں گے نقش پا کی طرح
رواں دواں ہیں فضاؤں میں ہم ہوا کی طرح

پکار وقت کی نزدیک تھی مگر ہم نے
سنا ہے دور سے آتی ہوئی صدا کی طرح

سیدہ فرحت

میری تنہائی کے صحرا سے نکالو مجھ کو
وقت کی تیز ہواؤں سے بچالو مجھ کو

آئینہ مرے تعاقب میں ہے، میں خائف ہوں
تم کسی اور نئی شکل میں ڈھالو مجھ کو

جمیلہ بانو

اب حنائی دست کی ہوں گی اجارہ داریاں
آنکھ میں شبنم جبیں کے نور میں رنگ شعور

بات کرنا موسم برسات کی پہلی جھڑی
مسکرا کے دیکھنا قوس قزح کا ہے ظہور

صغریٰ عالم

زخم کو پھول کہیں نوحے کو نغمہ سمجھیں
اتنے سادہ بھی نہیں ہم کہ نہ اتنا سمجھیں

زخم کا اپنے مداوا کسے منظور نہیں
ہاں مگر کیوں کسی قاتل کو مسیحا سمجھیں

بلقیس ظفیر الحسن

راز کی بات کھل نہ جائے کہیں
اس سے کہنا میری خبر تنہا

محفلیں میرے پیچھے آئیں گی
میں چلی جاؤں گی مگر تنہا

مریم غزالہ

ناولٹ

صندل ہاتھ

شہانہ اقبال

ماہم اور مونا کی دوستی گریجویشن کے آخری سال میں ہوئی تھی‘ جب مونا نے اس کے کالج میں داخلہ لیا تھا، دونوں ہم مزاج اور ہم زبان تھیں، اسی لیے بہت جلد گہری دوست بن گئیں، مونا ہاسٹل میں رہتی تھی جبکہ ماہم روز گھر سے کالج جاتی تھی، ویک اینڈ پر ماہم‘ مونا کو اپنے ساتھ گھر لے آتی، یوں دونوں کا وقت بہت اچھا گذرتا، مونا‘ ماہم کو اپنے آبائی گاؤں محبوب آباد کے رسم ورواج، شادی بیاہ کی تقاریب اور عیدین کے ہنگاموں کی تفصیل بتاتی‘ جن کے بارے میں سن کر ماہم کا دل چاہتا کہ وہ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

مونا کے والد وہاں کے جاگیر دار تھے، یہ سلسلہ نسل درنسل چلا آ رہا تھا، وہ لوگ بے شمار زرعی زمین کے مالک تھے، کاشتکاری ان کا خاندانی پیشہ تھا، کئی قول دار اور مزدور اُن کے کھیتوں میں کام کرتے تھے، انھیں اپنا ان ّ داتا سمجھ کر دل وجان سے ان کی عزت کرتے تھے۔

گریجویشن کے امتحان ختم ہوئے تو مونا اپنے گاؤں لوٹ گئی، جاتے جاتے ماہم کو اس بات پر راضی کر گئی کہ وہ اگلے ماہ اس کی بڑی بہن کی شادی میں شرکت کرنے گاؤں ضرور آئے گی۔

شادی سے دو دن پہلے مونا نے ماہم کو فون پر اطلاع دی کہ میں کل دولہن کا زیور لینے حیدر آباد آ رہی ہوں، واپسی پر تمھیں اپنے ساتھ گاؤں لے جاؤں گی، تیار رہنا۔

حسبِ وعدہ دوسرے دن ماہم نے مونا کے ساتھ محبوب آباد کے سفر کا آغاز کیا تو اُسے راستے بھر قدرت کے حسین نظارے دیکھنے کا پہلی بار موقع ملا، اونچے اونچے پہاڑ، گھنے جنگل، سبزے سے بھرے بڑے بڑے میدان‘ جنھیں دیکھ کر لگتا تھا جیسے کسی نے سبز رنگ کے قالین حدِ نظر تک بچھا دئے ہوں، کھیتوں کے لامتناہی سلسلے جن پر اناج کی بالیوں سے لدے ہرے بھرے پودے دور دور تک لہلہا رہے تھے، یہ سب کچھ ماہم نے پہلی بار دیکھا تھا۔

ماہم جب مونا کی حویلی پہنچی تو حیران رہ گئی، کیونکہ اس وضع کے گھر تو اس نے بس فلموں میں دیکھے تھے، حویلی میں قدم رکھتے ہی اسے محسوس ہوا جیسے وہ زعفران کے کھیت میں آ گئی ہو، ہر طرف پیلا ہی پیلا رنگ نظر آ رہا تھا، گھر کے سارے مکین اور مہمان زرد رنگ کے لباس میں ملبوس تھے، یہاں تک کہ گھر کے ملازم بھی پیلے کپڑے پہنے دکھائی دے رہے تھے، گیندے کے پھولوں کی لڑیوں سے حویلی کی دیواریں اور ستون سجائے گئے تھے، تختوں پر بچھی ہوئی ساری چادریں اور دروازوں اور کھڑکیوں پر پڑے سارے پردے بھی زرد رنگ کے تھے۔

مونا نے ماہم کو بتایا کہ دولہن کو چار دن پہلے مایوں بٹھایا گیا تھا، آج اس تقریب کا آخری دن ہے، کل صبح صبح دولہا اور باراتی آ جائیں گے اور شام ہونے سے پہلے پہلے دولہن کو رخصت کرا کے لیجائیں گے، گاؤں میں اب تک ”صبح تا نصف النہار“ دعوتوں کا رواج باقی ہے۔

سہ پہر دولہن کو ہلدی اور اُبٹن لگانے کی رسم منائی گئی، سات

سہاگنیں مل کر یہ رسم انجام دیتی ہیں، دولہن کی والدہ سے اچھا خاصا نیک وصول کر کے زیتون کے تیل میں گھولی گئی ہلدی اور زعفران ملے اُبٹن سے دولہن کے سارے جسم کی خوب مالش کی گئی، اس دوران دولہن کو چھیڑا جا رہا تھا، ہنسی مذاق چل رہا تھا، قہقہے اُبل رہے تھے، صحن میں چنبیلی کے منڈوے تلے نوعمر لڑکیاں بیٹھیں ڈھولک پر وداعی کے میٹھے میٹھے گیت گا رہی تھیں، بنّی اور بنّے کے گروپ بن گئے تھے جن کے درمیان نوک جھونک کا مقابلہ عروج پر تھا۔

گاؤں اور خاندان کی تجربہ کار خواتین باورچی خانہ سنبھالے بیٹھی تھیں، سات قسم کے تلن کئے جا رہے تھے، سات انواع کے پکوان سے مہمانوں کا دسترخوان سجایا جا رہا تھا۔

پورے گاؤں کی عام و خاص دعوت تھی، عورتیں اور بچے زنان خانہ میں آ جا رہے تھے، جبکہ مرد حضرت کی نشستوں اور طعام کا مردانے میں انتظام کیا گیا تھا، گاؤں کے مرد و خواتین تقریب میں اس خوش دلی سے حصہ لے رہے تھے کہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کون مہمان ہے اور کون میزبان۔

مونا ماہم کے ساتھ ساتھ تھی، اس کے پوچھے گئے سوالات کے جوابات دے رہی تھی، حویلی میں رات بھر پکوان چلتا رہا، صبح نو بجے باراتی دولہے کے ساتھ آن موجود ہوئے، ناشتے اور چائے سے تواضع کے بعد نکاح کی کاروائی کا آغاز ہوا، نکاح سے فارغ ہونے کا ''مبارک! سلامت!'' کے شور میں نوبت بجا کر اعلان کیا گیا، یہ ایک طرح کا نیوتہ تھا کہ دسترخوان بچھنے والا ہے، مہمان جلد سے جلد دولہن کے گھر آ جائیں، اسی شور میں صبح تا نصف النہار کی ضیافت کا آغاز ہوا۔

سویرے سویرے دولہن کو نہلا کر سسرال سے آیا سہاگ کا جوڑا پہنایا گیا، گاؤں والوں میں رواج ہے کہ نکاح سے پہلے نہ دولہن کو زیور پہناتے ہیں اور نہ ہی سنگھار کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ نکاح سے پہلے سنگھار کرنے سے دولہن پر نور نہیں آتا، ویسے نکاح کے بعد دولہن، دولہے والوں کی ملکیت ہو جاتی ہے، وہ جس طرح چاہے اُسے تیار کر لیں۔

نکاح کے بعد کھانے سے فارغ ہو کر نندیں دولہن کو وداعی کے لیے تیار کرنے آتی ہیں، دولہن کی ماں سے بھاری نیک لیکر دولہن کا سنگھار شروع کرتی ہیں، اس دوران مائیکہ والوں کو اس میں مداخلت کرنے یا انھیں مشورہ دینے کا کوئی حق نہیں ہوتا، سب سے پہلے دولہن کے بال سنوارے جاتے ہیں، دل بھر خوشبو والا تیل لگانے کے بعد گس کر چوٹی گوندھی جاتی تا کہ سسرال پہنچ کر بھی دولہن کا ایک بال بھی ادھر سے ادھر نہ ہو، چوٹی کے بعد زیور کی باری آتی ہے، گلے میں ہار، ہاتھوں میں کھوبڑا اور کنگن پہنانے کے بعد کانوں میں موٹی موٹی ڈنڈی کے جھمکے پہنا کر کان سرخ کر دئے جاتے ہیں، پندرہ بیس دن پہلے چھدوائی گئی ناک کی چھید میں سوا تولے کی موتیوں سے جڑی نتھ پہنائی جاتی ہے، بیچاری دولہن کی ناک سے لال لال خون رِسنے لگتا ہے، اور مارے درد کے آنکھوں سے بے رنگ پانی آنسوؤں کی شکل میں بہتا ہے، لیکن ہونٹوں پر اُف تک نہیں آتی، دولہن کی اِس تکلیف پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی، نندوں کو تو بھاوج کی قوتِ برداشت کا امتحان لینا ہوتا ہے کہ دیکھیں دولہن میں صبر وضبط کا کتنا مادّہ ہے، آگے زندگی میں کوئی تکلیف آئے تو اس کا سامنا کر پائے گی کہ نہیں۔

دولہن کو تیار کرنے کے بعد دولہا کو آرسی مصحف کے لیے زنان خانے میں بلایا جاتا ہے، سب سے پہلے اُن کا سسرالی خواتین سے تعارف کروایا جاتا ہے، بے چارے دولہا میاں سر تسلیم خم کر کے سب کو احتراماً جھک جھک کر سلام کرتے ہیں، ان میں سے کئی خواتین ایسی بھی ہوتی ہیں جو عمر میں ان سے چھوٹی لیکن رشتے میں ان سے بڑی ہوتی ہیں، اس لیے دولہا میاں سب کا ایک جیسا احترام کرتے ہیں۔

خواتین سے تعارف کے بعد دولہا میاں کو دولہن کے قریب مسند والے تخت پر بٹھایا گیا، دونوں کے درمیان ایک شیشہ رکھ کر دونوں کے اوپر سے دولہن کا گھونگھٹ اُڑھا دیا گیا، خاندان کی ایک معمر خاتون نے گھونگھٹ کے اندر دولہن کا چہرہ دولہے کو دکھایا، دولہا میاں نے دولہن کو دیکھنے کے بعد منہ دکھائی کی انگوٹھی پہنائی، اس کے بعد دولہن کو دولہے کا چہرہ شیشہ میں دکھایا گیا، بزرگوں کا ماننا ہے کہ شیشہ میں دولہا دولہن کا ایک دوسرے کو دیکھنا نیک شگون ہوتا ہے کہ زندگی بھر دونوں اپنے آپ سے زیادہ شیشہ میں دیکھے گئے چہرے کا خیال رکھتے ہیں۔

ایک بڑے سے کھوپرے میں دودھ ڈال کر لایا جاتا ہے جس پر ایک خاتون سورۂ والشّمس پڑھ کر دم کرتی ہیں اور اس دودھ سے دو گھونٹ پہلے دولہا میاں کو پلایا جاتا ہے اس کے بعد دولہے کا جھوٹا دودھ دولہن کو پلاتے ہیں، جو دونوں میں مزید قربت کا باعث بنتا ہے۔

اس رسم کے بعد دولہا دولہن کو وداعی کے پھول پہنائے جاتے ہیں، دولہن کے والد بیٹی کا ہاتھ دولہے کے ہاتھ میں دے کر سکھ دُکھ میں ہمیشہ ساتھ دینے کا وعدہ لیتے ہیں اس کے بعد سلامیوں کا سلسلہ چلتا ہے، دولہا میاں ہر سلامی کے بعد اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر ادب سے سلام کرتے ہیں، چاہے وہ سلامی پڑوسن کی دی ہوئی پچاس روپئے اور ایک توال ہی کی کیوں نہ ہو، آخری سلامی سالی کی ہوتی ہے، چاندی کی تھالی میں بریانی ہوتی ہے جو بڑے احترام سے دولہا میاں قبول کرتے ہیں یہ مستقبل میں سسرال میں کی جانے والی ضیافتوں کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

سلامیوں سے فارغ ہونے کے بعد دولہے کی بہن نے نہ جانے اُن کے کان میں کیا کہا کہ وہ تنہاء اُٹھ کر اپنے دوست کے ساتھ مردانے میں چلے گئے۔

ماہم نے پریشان ہوکر پوچھا: ''اب کیا ہوگا؟''

''اب رخصتی سے پہلے کی سب سے اہم رسم ہوتی ہے، دولہن کے بزرگ، والد اور بھائی دولہن کو صندل ہاتھ دے کر مائیکہ سے رخصت کرتے ہیں۔'' ماہم بڑی دلچسپی سے ہونے والی رسم دیکھنے کی منتظر تھی۔

ایک کشتی میں رکھے بڑے سے پیالے میں عطر اور صندل کے آمیزے میں پان رکھ کر دولہن کے سامنے رکھتے ہیں، سب سے پہلے دولہن کے نانا آتے ہیں، انھوں نے پان کا پتہ صندل میں بھگو کر دولہن کے مہندی لگے دونوں پیروں پر صندل لگایا اور کچھ کھنکھناتے سکّے دولہن پر سے وار کر کشتی میں ڈالے اور کہا

''بیٹی! جس طرح تم عزت کے ساتھ ہمارے گھر سے وداع ہو رہی ہو،اسی طرح سسرال میں بھی اپنے حسن سلوک سے ہماری عزت کو بڑھا کر ہمیں سُرخرو کرنا۔''

دولہن کے نانا کے بعد والد، چاچا، ماموں، خالو اور دولہن کے بھائیوں نے بھی اس رسم کو دُہرایا اور دولہن کو اپنے اپنے انداز میں دعائیں دیں۔

ماہم' مونا کے ساتھ دولہن کے بالکل قریب کھڑی اس عجیب و غریب رسم کو غور سے دیکھ رہی تھی جو خاندان کے مرد حضرات ہی ادا کر رہے تھے، اس میں خواتین کا کوئی دخل نہیں تھا، ماہم حیران تھی کہ یہ کیسی رسم ہے جس میں خاندانی بزرگ دولہن کے پاؤں چھو رہے تھے؟

''اس رسم کا کیا مطلب ہے؟'' ماہم نے اپنی سہیلی سے پوچھا۔

''یہ بیٹی کو وداع کرنے سے پہلے کی بڑی خاص رسم ہوتی ہے جس میں دولہن کے سارے قریبی مرد رشتہ دار دولہن کو صندل ہاتھ دے کر اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ تم نے ہمیں اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق عزت سے وداع کرنے کا موقع دے کر خاندان قبیلے اور گاؤں بھر میں ہماری لاج رکھ لی، خدانخواستہ! اگر تم کوئی ایسی ویسی حرکت کرتیں یا اپنی پسند کی شادی کے لیے کسی لڑکے کے ساتھ فرار ہوجاتیں تو ہم خاندان کے مردوں کے لیے ڈوب مرنے کی بات ہوتی۔'' مونا نے بتایا

مونا کی زبانی یہ باتیں سن کر ماہم کا وہاں کھڑا رہنا دشوار ہوگیا، اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور سر چکرانے لگا، بڑی مشکل سے وہ وہاں سے دولہن کے خالی کمرے میں آئی اور خزاں کے آخری زرد پتے کی طرح تخت پر گر گئی۔

''میرے اللہ!'' وہ آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی، ''مجھے معاف کردے، میرے مالک! یہ میں کیا کرنے جا رہی تھی؟'' وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے روتی رہی، ''آج اگر میں اس شادی میں شرکت نہ کرتی تو اپنے بیہودہ منصوبے پر عمل کر کے نہ دین کی رہتی نہ دنیا کی، مجھے یہ احساس بھی نہ ہوتا کہ میں کتنا سنگین گناہ کرنے جا رہی تھی، اچھا ہوا جو مجھے وقت پر ہوش آ گیا۔''

ماہم اپنے کالج کے ایک جونیئر لیکچرر سے محبت کرنے لگی تھی، وجہی نہ صرف نام کا وجہی تھا بلکہ اس کی شخصیت بھی وجاہت سے بھرپور تھی، خوش مزاج، خوش لباس اور خوش گفتار، تب ہی تو وہ سو جان سے اس پر فداء ہوگئی تھی، وجہی نے دو سال پہلے اسی کالج سے اپنی تعلیم مکمل کی تھی، اس کی قابلیت کے باعث جب اُسے کالج انتظامیہ نے لیکچرر شپ کا جاب آفر کیا تو اس نے بخوشی منظور کرلیا، سوچا کہ تجربہ کی خاطر دو ایک سال اسی کالج میں جاب کرلیں تو کیا بُرا ہے۔

خوبصورت قد و خال، سونے جیسا چمکتا رنگ، اپنے آپ کو دوسروں میں منفرد منوانے کے ہنر میں ماہر، ماہم کو جب وجہی نے دیکھا تو وہ بھی اُسے پسند کرنے لگا، پسندیدہ جنسِ مخالف جب روز روز ایک دوسرے کے سامنے آئے تو پسندیدگی کا تاثر محبت میں بدلتے دیر نہیں لگتی۔

ایک دن وجہی نے ماں کے سامنے ماہم کو کھڑا کر کے کہا: ''امی! مجھے یہ لڑکی پسند ہے، اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

ماں کو بھی ماہم ایک ہی نظر میں پسند آ گئی، انھوں نے ماہم کی بلائیں لیتے ہوئے خوش دلی اور شفقت سے کہا: ''ماشاءاللہ! بہت پیاری ہے، میرا بیٹا بھی کسی سے کم نہیں، بالکل چاند اور سورج کی جوڑی لگے گی۔''

ماہم نے وجہی کو اپنے والدین سے ملایا تو وہ بھی اس رشتے کے لیے راضی ہوگئے، ماہم اور وجہی کا سنہرا خواب تو اس وقت ٹوٹا جب دونوں کے والدین کو پتہ چلا کہ ماہم سُنّی لڑکی ہے اور وجہی شیعہ لڑکا ہے، تو دونوں کے والدین نے رشتے سے انکار کردیا، ماہم اور وجہی نے اپنے اپنے والدین کو راضی کرنے کی جان توڑ کوشش کی، لیکن وہ کسی طرح رضامند نہیں ہوئے۔

وجہی کے والد نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ تم اگر کسی غیر مسلم لڑکی کو پسند کرلیتے تو ہم خوشی سے اُسے اپنی بہو بنا لیتے، لیکن ایک سُنّی لڑکی کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ اُسے اگر کوئی نعمت آسانی سے میسر آجائے تو اس کی قدر و قیمت کا احساس نہیں ہوتا، لیکن جس مقصد کے حصول میں دشواری پیش آئے تو انسان کی طلب میں پاگل پن شامل ہوجاتا ہے، ماہم اور وجہی نے فیصلہ کرلیا کہ دونوں اپنے اپنے والدین کے خلاف جا کر بھی شادی ضرور کریں گے۔

مونا کے ساتھ شادی میں شرکت کے لیے گھر سے نکلنے سے پہلے دونوں نے پلان بنایا کہ وہ شادی سے گھر واپس آنے کے بجائے بمبئی کے لیے روانہ ہوجائیں گے جہاں وجہی کے دوست نے ان کے قیام اور شادی کا سارا انتظام اپنے ذمہ لے لیا تھا، دونوں کا خیال تھا کے ایک بار شادی ہوجائے تو ان کے والدین کو انھیں معاف کرکے اپنانا ہی ہوگا۔

شادی میں صندل ہاتھ کی رسم دیکھنے سے پہلے ماہم کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے گھر سے فرار ہوجانے کے بعد گھر کے مکینوں اور خاندان والوں پر کیا کچھ گذرے گی، ایسے رسم ورواج لڑکیوں کی عملی تربیت کا ایک بہترین ذریعہ ہیں جسے لڑکیاں مثبت انداز میں قبول کرتی ہیں اور شرعی حدود کو پھلانگنے کی کوشش نہیں کرتیں۔

ماہم نے سوچا میرے وہ والدین جو مجھے دنیا میں لانے کا سبب بنے، جنھوں نے پال پوس کر مجھے بڑا کیا، پڑھا لکھا کر قابل بنایا، میں انہی کی نافرمانی میں اتنا سنگین قدم اٹھانے جارہی تھی، مجھ سے تو گاؤں کے ماحول میں پلی بڑھی کم تعلیم یافتہ لڑکی لاکھ درجہ بہتر ہے، جو اپنے خاندان کے مرد حضرات کی سرپرستی میں عزت وآبرو سے رخصت ہورہی ہے، اس نیک اور پاکیزہ لڑکی کے قدموں کو چھو کر اس کے محافظ اس کا احسان مان رہے ہیں کہ اس نے انھیں سارے خاندان، قبیلے اور گاؤں میں سُرخرو ہونے کا موقع دیا۔

میرے والدین کو جب میرے بارے میں پتہ چلے گا کہ میں نے گھر سے بھاگ کر وجہی کے ساتھ شادی کرلی ہے تو وہ جیتے جی مرجائیں گے، میرے غیرت مند بھائی تو مارنے مرنے پر تیار ہوجائیں گے، میری بہنوں کا ان کے سسرال میں جینا دوبھر ہوجائے گا، میری بھابیاں میرے بھائیوں کو میری بدچلنی کے طعنے دے دے کر اُن کا سر شرم سے جھکا دیں گی، میری ذات پر صرف میرا اپنا حق تو نہیں جو میں اپنی مرضی سے اپنے بارے میں فیصلہ کروں، میں رشتوں میں کئی لوگوں سے جُڑی ہوئی ہوں، جن کی مرضی کا احترام کرنا میرا اولین فرض ہے، یہ سوچ سوچ کر اس کے آنسو تیزی سے بہنے لگے۔

مونا نے ماہم کو اپنے قریب نہ پایا تو متلاشی نظروں سے آس پاس دیکھا، جب وہ وہاں نظر نہ آئی تو اُسے ڈھونڈتی دولہن کے کمرے میں آئی، اُسے کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''کیا ہوا ماہم؟ یہاں کیوں آگئی؟ تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ یہ تم رو کیوں رہی ہو؟'' اس نے ایک ساتھ کئی سوال کردیے۔

''کچھ نہیں! زیبا کی رخصتی کی رسم دیکھ کر میرا دل بھر آیا، کیا سب ہی لڑکیوں کو اسی طرح اپنے ابو اور امی کو چھوڑ کر جانا ہوتا ہے؟ اس خیال کے ساتھ ہی مجھے امی ابو کی یاد نے تڑپا دیا۔'' ماہم دلگیر آواز میں بولی۔

''اچھا!'' مونا ہنستے ہوئے بولی، ''صرف دو دن ان سے دور رہ کر تمھارا یہ حال ہوگیا، شادی کے بعد ان سے جدا کیسے رہوگی؟ اور اگر میاں کے ساتھ پردیس جانا ہوا تو؟''

''مونا! میں جلد سے جلد گھر جانا چاہتی ہوں، صبح حیدرآباد جانے والی بس کب ملے گی؟'' ماہم نے اس کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''کیوں کیوں؟'' مونا نے جلدی سے پوچھا، ''تم تو ولیمہ کے بعد واپس جانے والی تھیں؟''

''میں دو دن اور نہیں رہ سکتی، جتنی جلد ممکن ہے مجھے گھر واپس جانا ہے، صبح پہلی بس کب نکلتی ہے؟'' ماہم نے اصرار کیا۔

تو مونا نے اُسے تعجب سے دیکھتے ہوئے کہا: ''صبح چھ بجے!''۔

''مجھے صبح کی بس میں سوار کروا دو نا پلیز!'' ماہم نے عاجزی سے کہا، تو مونا نے غیرارادی طور پر اثبات میں گردن ہلادی۔

دوسرے دن دوپہر کو جب ماہم اچانک گھر پہنچی تو اپنی ماں سے لپٹ کر رونے لگی، اس کی ماں نے حیران وپریشان خود سے لپٹی بیٹی کے سر اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا: ''کیا ہوا میری جان! کیوں رو رہی ہو؟''

''کچھ نہیں امی! آپ کو دیکھ کر میرا دل بھر آیا، مجھ سے وعدہ کریں کہ مجھے اس طرح اکیلے کہیں بھی نہیں جانے دیں گی، اگر مجھے کچھ ہوجاتا تو؟'' ماہم نے روتے ہوئے پوچھا۔

''پگلی! تم اتنی کم ہمت نکلوگی یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔'' اس کی امی نے اس کے آنسو پوچھتے ہوئے کہا، ''بس اب یہ رونا بند کرو، اپنے ابو کے آنے سے پہلے نارمل ہوجاؤ۔''

''بات کم ہمتی کی نہیں امی! بات تو غیر معمولی ہمت کی تھی، اچھا ہوا جو مجھے وقت پر ہوش آگیا، ورنہ آپ کی یہ محبت نفرت میں بدل جاتی۔'' ماہم نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے ماں کو دیکھتے ہوئے دل میں سوچا، لیکن زبان سے کچھ نہ بولی۔

ماہم کی امی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے دیوان پر بٹھایا اس کے بال سنوارے اور اُس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اُن پر بوسہ دیا اور بولیں:

''خواہ مخواہ رو رو کر ہلکان ہو رہی ہو، ٹھہرو میں تمھارے لیے پانی لاتی ہوں۔''

ماں کچن سے پانی کا گلاس لے آئیں اور اُسے پیار سے پلانے لگیں، ماں کی پُر وقار شخصیت اور ان کے نورانی چہرے پر چھائے ممتا کے بےلوث جذبے کو شکر گذاری سے دیکھتے ہوئے ماہم نے ایک مقبول ترین حج کا ثواب حاصل کر لیا، احسان مندی محسوس کرتے ہوئے ماہم کی آنکھیں دوبارہ جل تھل ہو گئیں۔

''تم پھر شروع ہو گئیں؟'' ماں نے نرمی سے سرزنش کی، ''چلو! اب آنسو بہانا بند کرو۔''

''انھیں بہنے دو امی!'' ماہم نے اپنی ماں کے دونوں ہاتھ تھام کر اُن پر بوسہ دے کر اپنی آنکھوں سے لگایا اور اُن کے سینے سے لگ کر بولی: ''یہ ندامت کے وہ آنسو ہیں جن کے بارے میں شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

موتی سمجھ کر شانِ کریمی نے چُن لیے
آنسو جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

□□□

Mrs. Shahana Iqbal
Shahana Manzil
H.No:8-1-21/9,
Suriya Nagar Colony, Tolichowki,
Hyderbabad-500008 T.S.
Cell: 9618559318

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر............................ بتاریخ..

بنام National Council for Promotion of Urdu Language مسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے 90092010045326 :IFSC:CNRB0019009، A/C

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

ڈاکٹر نسرین بیگم علیگ

ادھورے خواب

ارم کے گھر کے حالات اچھے نہیں تھے۔ مفلسی اور تنگ دستی میں زندگی کسی طرح گزر رہی تھی۔اب کام کرنا بھی اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ارم کے والد کافی دنوں سے بیمار تھے۔غریبی نے زندگی کی خوشیوں کو جیسے ختم ہی کر دیا تھا۔۔۔انسان کو اپنی روز مرہ کی ضروریات کو پوری کرنے کے لیے تو اسے در بدر کی خاک تو چھاننی ہی پڑتی ہے!!!! مفلسی کی وجہ سے اپنوں کی آنکھوں میں بھی ذلیل و رسوا ہونا پڑتا ہے۔۔۔ان غریبوں کو دولت مند کبھی منھ بھی نہیں لگاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان لوگوں سے ملنا بھی پسند نہیں کرتے ۔۔۔انھیں شرم آتی ہے یہ بتانے میں کہ یہ لوگ ہمارے رشتہ دار ہیں۔ان رئیسوں نے جنھیں تھوڑی دولت حاصل ہوگئی تھی وہ تو غریب ہونے کو جیسے عیب ہی سمجھ بیٹھے۔جبکہ کل تک ان کی حالت بھی کچھ خاص نہیں تھی۔۔۔۔کتنے نادان ہیں ایسی سوچ رکھنے والے لوگ!!!

باہر دیکھو تو جگمگاتی سڑکیں، بڑے بڑے شاپنگ کامپلکس، چہل پہل جیسے سب خوش و خرم ہیں۔۔۔۔مگر نہیں! اس چکا چوندھ سے کیا پیٹ بھر سکتا ہے؟ پیٹ بھرنے کے لیے تو روٹی چاہیے۔انسان دو وقت کی روٹی جٹانے میں لگا رہتا ہے۔پیٹ کا سوال اس کے سامنے پہلے ہوتا ہے۔غریبی اور بھوک کی شدت سے کام کرنے کی صلاحیت بھی تو کم ہو جاتی ہے۔بہر کیف مفلسی میں جو ہو سو کم ہے۔

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

غریبی کی وجہ سے ارم کے والد کی بیماری اور اس بیماری کا علاج اور دوا کا انتظام نہ ہو پانا۔۔۔یہ بھی تو سچ ہے کہ بیماری کے علاج کے لیے دوا کا انتظام ہو اور پیٹ بھرنے کے لیے دو وقت کی روٹی نصیب ہو۔۔۔کسی طرح سے ارم اور گھر کے لوگوں کی زندگی چل رہی تھی۔مگر یہ زندگی چلتے چلتے، اس وقت تھم سی گئی جب ارم کے والد بیماری کی تاب نہ لا کر اور دوا کے نہ مل پانے کے سبب موت کے منھ میں چلے گئے۔۔۔ارم اور گھر والے یہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھتے رہ گئے، کیا کرتے روپئے کہاں تھے علاج کے لیے۔روپئے میں طاقت ہی ایسی ہے۔روپئے ہوتے تب تو علاج ہوتا۔۔ ڈاکٹر تو علاج سے پہلے ہی روپئے رکھوا لیتے ہیں۔لوگوں کے دل تو جیسے پتھر ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔

ارم کو والد کا ہی تو سہارا تھا۔اور گھر، کسی طرح چل رہا تھا۔مگر اب تو وہ سہارا بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ارم پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔اسے کیا معلوم تھا کہ وقت و حالات اسے اس مقام پر لا کھڑا کر دیں گے۔غم اور تکلیف کے دن کس طرح گزرتے۔انسان کی ضروریات بھی کبھی ختم ہوتی ہے۔۔۔غم کے دن اور پہاڑ جیسی راتیں کس طرح کٹتی ہیں، اس کا اندازہ

اسی کو ہوسکتا ہے جس نے تکلیف کے دن کاٹے ہوں اور خون کے آنسو بہائے ہوں۔۔۔۔۔خدانہ کرے یہ دن کسی کو دیکھنا پڑے۔

مفلسی ایک ایسا مرض ہے ،جس کا علاج مشکل سے ہوتا ہے۔ لوگ کسی کو خوش دیکھنا کہاں چاہتے ہیں۔آدمی انسان کہاں رہا بلکہ جانور سے بھی بدتر ہوگیا ہے۔جانوروں میں تو محبت باقی ہے اور وہ وفادار بھی ہوتا ہے۔انسان تو کسی کی مدد کرنا جیسے بھول چکا ہے۔آج کا انسان مدد اس لیے بھی نہیں کرتا کہ کہیں وہ اس سے آگے نہ نکل جائے۔۔۔مگر ہم یہ جانتے ہیں کہ تعلیم ہی وہ واحد راستہ ہے جس کو حاصل کرنے کے بعد ہمیں کسی سے مدد نہیں مانگنی پڑتی ہے۔جسے حاصل کر ہم آگے بڑھ سکتے ہیں، ترقی کر سکتے ہیں۔۔۔۔تعلیم ہی ہماری وہ دولت ہے جسے کوئی چرا نہیں سکتا اور اسے حاصل کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔بس جذبہ ہونا چاہیے۔جذبے کے ساتھ محنت اور یکسوئی بھی ضروری ہے۔۔۔۔

ارم کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔اس کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح اپنی تعلیم مکمل کر لے اور کسی لائق بن جائے مگر اس منزل تک پہنچنے کے لیے راستے میں بیحد دشواریاں تھیں۔غریبی تھی، اس لیے راستے مشکل تھے۔۔۔مگر مشکل راستے پر چل کر ہی تو انسان کامیابی کی طرف بڑھتا ہے۔۔۔اور اگر حوصلہ ہو تو منزل قریب آتی چلی جاتی ہے۔۔۔۔

یہ بھی تو حقیقت ہے کہ ہم صحیح راستے پر چلنا چاہتے ہیں تو دشواریاں تو آئیں گی اور ہمیں ان کا سامنا بھی ہمت سے کرنا پڑے گا۔۔۔۔۔ پڑھائی کو جاری رکھنے کے لیے محنت کے ساتھ ساتھ روپیوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔مگر فوری طور پر یہ روپئے ارم کے پاس کہاں سے آتے۔اسے امتحان کے فارم کے لیے فیس کے لیے روپئے چاہیے تھے۔۔۔۔اللہ بھی کبھی کبھی اپنے بندوں سے سخت امتحان لیتا ہے۔ارم بھی اس امتحان سے گزر رہی تھی۔۔۔۔

وہ دن ارم کے لیے بڑا عجیب تھا اور وہ دن اس کے لیے خاص بھی تھا۔آگے تعلیم جاری رکھنے کے لیے۔آج کا دن اس کے لیے آزمائش کا بھی دن تھا۔اپنی اس آزمائش میں اگر وہ کھری نہ اترتی تو اس کی زندگی لمحوں میں بکھر جاتی۔اس کی پورے سال کی محنت برباد ہو جاتی۔اس کے خواب کا محل پل بھر میں زمیں دوز ہو جاتا، اور اس کے خواب ہمیشہ کے لیے ادھورے ہی رہ جاتے۔

محلے کی ساری لڑکیاں کالج جا رہی تھیں ان کے دلوں میں جوش اور خوشی تھی۔وقت گزرتا جا رہا تھا، ارم تڑپ رہی تھی اس طرح جیسے کسی مچھلی کو پانی سے نکال کر باہر رکھ دیا گیا ہو اور تھوڑی دیر تک پانی نہ ملا تو اس کا مرنا طئے ہے۔اگر آج کا وقت ہاتھ سے نکل گیا تو پڑھائی ادھوری رہ جائے گی۔ فارم بھرنے کے لیے روپئے کہاں سے آئیں گے۔کون دے گا؟۔

کالج جانے کے لیے وہ تیار تھی اور دعا کر رہی تھی کہ اے اللہ ہماری مدد کر۔بس میں کسی طرح فارم بھر دوں۔بس تو ہی اس مشکل وقت میں کوئی نہ کوئی راستہ نکال سکتا ہے۔۔۔ہاں یہ تو حقیقت ہے کہ دل سے نکلی آواز کبھی خالی نہیں جاتی ضرور پوری ہوتی ہے۔انسان کی لگن اور محنت اسے آگے بڑھنے میں ہمیشہ حوصلہ دیتے ہیں دنیا ابھی نیک اور ہمدرد لوگوں سے خالی نہیں ہے۔۔۔۔

ارم کے دل کی آواز اللہ نے سن لی پڑوس میں رہنے والی ایک معلّمہ جو اسی کالج میں پڑھاتی تھیں، انھیں جیسے ہی معلوم ہوا انھوں نے فیس کے روپئے ارم کو بلا کر دے دیے۔جاؤ فارم بھرو۔۔۔شاید ان کے ضمیر نے انھیں جھنجھوڑا کہ تم ایک استاد ہو۔استاد کا کام صحیح راستہ بتانا اور مدد کرنا ہوتا ہے۔اللہ نے اسے علم کی دولت سے سرفراز کیا ہے۔ارم کے امتحان کے فارم بھر گئے۔وہ روپئے جو استانی نے دئے تھے ارم نے بہت جلد سلائی کر کے واپس کر دئے۔ارم نے اچھے نمبروں سے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا اور محنت اور لگن سے پڑھتے ہوئے اس نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان بھی پاس کر لیا۔اب اس کا داخلہ بی اے میں ہوگیا۔وہ گھر میں سلائی کرتی رہی تا کہ گھر کا خرچ چلتا رہے اور چھوٹے بھائی کی پڑھائی جاری رہے۔وہ یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ محنت سے اندھیرے کو دور کیا جا سکتا ہے اور اندھیرے سے روشنی کی طرف آنے میں ہمیں محنت تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ اور ایک بار اس راستے پر چل پڑے تو آگے بڑھتے ہی جاتے ہیں۔

ارم کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا تعلیم حاصل کرنا اور ملازمت کر کے اپنے گھر کے حالات کو بہتر بنانے میں مدد کرنا۔یہی اس کا عزم تھا۔ ارم کو بار بار بڑے بھائی کی طرف سے یہ سننا پڑتا کہ بس، اب ہو چکی پڑھائی، گھر بیٹھو، کیا پڑھ لکھ کر نوکری کرو گی۔۔۔۔۔۔تمھاری کمائی سے یہ گھر چلے گا۔۔۔۔۔یہ بالکل ٹھیک نہیں ہے زیادہ پڑھ لکھ کر ڈگری لے لو گی۔۔۔۔۔تو ہم تمھارے لیے لڑکا کہاں تلاش کریں گے۔۔۔۔۔۔نہ اتنا پڑھا لکھا لڑکا ملے گا اور نہ ہی تمھاری شادی ہو سکے گی، لوگ یہی تو کہیں گے لو! جوان لڑکی کو گھر میں کیسے بٹھا رکھا ہے۔۔۔۔۔طعنے سن سن کر جینا حرام ہو جائے گا۔۔۔۔لوگ بغیر سوچے سمجھے طعنے دیں گے اور ان لوگوں کی زبان نہ تھکے گی۔۔،،۔لڑکی کی کمائی کھا رہے ہیں اس لیے اس کی شادی کیوں کریں گے۔۔۔شادی کر دیں گے تو ان کی روٹی کیسے چلے گی۔ اسی لیے تو لڑکی کو پڑھایا ہے۔۔۔۔۔

بھائی کی اس بات میں دم تو ہے ۔۔۔۔آج سماج کے سامنے پڑھی لکھی لڑکیوں کی شادی ایک ایسا معمہ ہے، جسے سلجھانا اتنا آسان بھی نہیں ہے۔مگر پھر بھی شادی کی بات کو لے کرلڑکی تعلیم ہی حاصل نہ کرے، یہ تو ممکن نہیں ہے ۔۔۔اسے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کرنی ہے اور آگے بھی بڑھنا ہے ۔۔۔۔بس سوچ بدلنے کی ضرورت ہے ۔۔۔لڑکوں کو بھی اعلی تعلیم حاصل کرنے کی طرف سوچنا پڑے گا۔سماج تبھی بدلے گا، جب سوچ بدلے گی ۔اور سوچ بدلنے کے لیے والدین اور گھر کے بڑوں کولڑکوں کو بہتر تربیت کا خاص انتظام کرنا ہوگا۔آسان راستہ تلاش کرنا اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔لڑکیاں تو محنت کر لیتی ہیں مگرلڑکوں کو لائق بنانے میں والدین کو زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔

ارم بھائی کی باتوں کو سن کر بول اٹھی ۔۔۔نہیں بھیا!!!!!! آپ ایسا نہ کہیں ۔۔۔ہم اپنے پیر پر کھڑے ہو جائیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا ۔۔ارم کو اس بات کا احساس تھا کہ اندھیرے موت کی علامت ہیں اور ہمیں اس راستے پر چلنا ہے جس پر روشنی نظر آرہی ہے، کیوں کہ روشنی زندگی کی علامت ہے ۔۔۔ارم ہمیشہ یہی کہا کرتی تھی کہ ہمیں زندگی چاہیے۔ اپنی منزل چاہیے اور ہمیں یہ منزل علم کی روشنی سے ہی ملے گی ۔۔۔

ارم کا بڑا بھائی تو اسی میں خوش تھا کہ اسے دو وقت کی روٹی مل رہی ہے۔بس بہت ہے ۔۔۔۔ماں اور ارم گھر میں سلائی کرتی تھیں ۔زندگی کی گاڑی بس کسی طرح چل رہی تھی ۔گھر کے حالات بہتر ہوں اس کی فکر تو بڑے بھائی کو بالکل نہیں تھی۔

ماں کو پورا یقین تھا کہ ایک دن ہمارے حالات بہتر ہوں گے۔ آج جو اندھیرا ہے وہ کل نہ ہوگا ،اندھیرے نے اپنے اندر سورج جیسی روشنی چھپا رکھی ہے اور اس روشنی کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں مختلف طرح کے امتحانات سے گزرنا ہوگا۔۔۔اس راستے پر چٹانیں ملیں گی، جسے اپنے مستحکم ارادوں سے توڑنا ہوگا۔۔۔خاردار راستوں پر چل کر آگے بڑھنا ہوگا ۔۔۔تکلیفیں برداشت کرنی ہوں گی ۔کیوں کہ رکنا موت کی علامت ہے اور مسلسل چلتے رہنا زندگی کی علامت ہے ۔۔۔۔

ارم کو پوری امید تھی کہ اس کو نوکری ضرور ملے گی اور حالات بہتر ہوں گے۔انٹرویو کے لیے وہ کئی جگہ گئی ۔وہ سوچتی تھی کہ ہم نے جو خواب دیکھے ہیں وہ خواب ادھورے نہیں رہیں گے ۔۔ہمیں اپنی محنت کا صلہ ضرور ملے گا ۔ماں کی دعائیں ہمیشہ اس کے ساتھ تھیں ۔۔۔ارم کو نوکری مل گئی اور اس نے جوائن کر لیا۔آج وہ بیحد خوش تھی ۔اسے اپنے ادھورے خواب پورے کرنے تھے ۔اس خواب کی تعبیر کو حقیقت میں بدلنے کے لیے اس نے اپنی زندگی کے ہر لمحے اور ہر سانس کو، راتوں کی نیند سے بوجھل پلکوں پر اس بار کو اٹھائے رکھا تھا۔اسے اپنی محنت پر پورا بھروسا تھا۔

ارم کو نوکری مل جانے کے بعد محلے کے لوگ اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو ارم کی مثال دینے لگے ۔۔۔۔دیکھو ارم کو! کتنی محنتی اور سمجھدار لڑکی ہے۔اس کی وجہ سے گھر کے حالات اب کتنے بہتر ہو گئے ۔۔۔بھائی کو تو بالکل پرواہ نہیں تھی ۔وہ تو دو روٹی کھا کر خوش تھا۔انسان صرف پیٹ پالنے کے لیے تھوڑے ہی پیدا ہوا ہے ۔۔۔رم بڑی نیک ہے ۔۔۔لڑکی ہو تو ارم جیسی۔

یہ ساری باتیں محلے والوں کی زبان سے سن کر ارم کی ماں کی خوشی کی انتہا نہ رہتی۔اللہ بڑا مہربان ہے وہ محنت کا پھل ہمیشہ دیتا ہے۔وہ خوش ہوتیں اور اللہ کا شکرادا کرتیں ۔۔۔۔بڑا بھائی تو شرمندہ تھا اور خود کی ناکامی پر افسوس کر رہا تھا۔آج اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔مگر وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا اور گزرا ہوا وقت کبھی واپس نہیں آتا ۔۔۔۔وقت ہر انسان کو موقع دیتا ہے مگر ہم موقع کو آسانی سے گنوا دیتے ہیں ۔۔۔کاش ہم وقت کی قدر کرتے تو اپنی حالت بدلنے میں کامیاب ہوتے۔

ارم کے جو خواب ادھورے تھے اسے اس کو پورے کرنے تھے۔جن مشکلات پر چلتے ہوئے اس کو اس منزل پر پہنچنے کا راستہ ملا ہے ،اسے وہ گنوانا نہیں چاہتی تھی ۔۔۔۔ارم سوچ رہی تھی ،اور یہ کہتی بھی جا رہی تھی ۔۔۔۔جس منزل پر پہنچنے کا خواب ہم نے دیکھا تھا،اس خواب کی تعبیر کو سچ کرنا ہے ۔۔۔۔ہمیں اپنی ماں کے دامن کو خوشیوں سے بھر دینا ہے اور ہمیں پورا یقین ہے کہ اب ہمارے سارے ادھورے خواب پورے ہوں گے ۔۔۔۔زندگی خدا کی دی ہوئی نعمت ہے جو صرف ایک بار ملتی ہے ۔۔۔۔ادھورے خواب تو محنت اور ایمانداری سے ہی پورے ہوتے ہیں!!!! محنت کے ساتھ ایمانداری شرط ہے ۔۔۔ جب ایمانداری ہوگی، تو ہم محنت سے کام کریں گے ۔۔۔۔تبھی تو ہمیں سچی خوشی حاصل ہوتی ہے اور اس خوشی کا احساس ہمیشہ ہوتا رہتا ہے ۔۔۔۔اور ہم اپنے ادھورے خواب کو پورا کرنے میں ضرور کامیاب ہوتے ہیں۔

□□□

Dr. Nasreen Begam (Alig)
Head Dept. of Urdu
Baikunthi Devi Girls (P.G) College
Agra-282001 (U.P)

محمودہ قریشی

جھوٹی مسکراہٹ

''باجی، آپ کی مسکراہٹ سے ہماری صبح خوشگوار ہو جاتی ہے''۔

ہمیں آپ کے ساتھ ہی سونا ہے۔ خالدہ آپی تو دیر تک خود بھی سوتی ہیں۔ اور ہم سے بھی سونے کے لیے کہتی ہیں۔

''ابھی سو جاؤ۔ بہت رات ہو رہی ہے۔''

ان کے پاس سونا تو اپنی رات ہی خراب کرنا ہے جیسے۔ دیر رات تک فیس بک چلاتی ہیں۔ اور پوری رات گیم کھیلتی ہیں۔ خود بھی نہیں سوتیں۔ اور ہمیں بھی سونے نہیں دیتی ہیں۔ دیر رات تک جاگنے کی خالدہ آپی نے خود تو ایسی بری عادت ڈال رکھی ہے اور ہمیں بھی اسی بیماری میں مبتلا کرنا چاہتی ہیں۔''

باجی، اگر ان کے پاس سے خود سے اٹھنے کی کوشش بھی کروں تو ایسے جھنجھلاتی ہیں جیسے طمانچہ ہی جڑ دیں گی۔

''باجی ہمیں آپ کے ساتھ ہی سونا ہے۔''

''باجی آپ کتنے خلوص سے اپنی مسکراہٹ سے نیند سے جگاتی ہو۔ آپ کی مسکراہٹ دیکھتے ہی ہماری نیند تو غائب ہو جاتی ہے۔''

میرے سبھی بہنوں نے بلند آواز میں خالدہ کی شکایت کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

میں نے سب ہی بھائی بہنوں کو مسکرا کر گلے لگا لیا اور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ ہم سب لوگ ایک ساتھ اکھٹا سوئیں گے اور تم ہمیشہ میرے پاس ہی سونا۔ کوئی ضرورت نہیں تمھیں خالدہ کے پاس سونے کی۔''

''ٹھیک ہے باجی تھینک یو۔''

سبھی نے ایک ساتھ مجھے جواب دیا۔ میں اپنے سبھی بھائی بہنوں میں سب سے بڑی ہونے کے ساتھ بہت ہی خوبصورت نیک دل بھی سمجھی جاتی تھی۔ امی میرے اخلاق و کردار کی تعریف کرتے نہیں تھکتی تھیں۔ امی کی فرمانبردار بیٹی ہونے کے ساتھ خوش مزاج باجی بھی ہوں۔ میری تین چھوٹی بہنیں اور دو چھوٹے بھائی ہیں۔ ان سے میں بہت محبت کرتی ہوں۔ سبھی کا امی کی طرح خیال رکھنا بھی میں اپنا فرض سمجھتی اور سبھی بھائی بہن بھی مجھے اتنی ہی محبت کرتے ہیں۔ اس لیے امی کو اب گھر کی زیادہ فکر نہیں رہتی ہے۔ چونکہ ان کو مجھ پر پورا یقین تھا کہ میں ان کی غیر موجودگی میں بھی سب کچھ بہت اچھے سے سنبھال لیتی تھی۔ کوئی بھی بھائی بہن اسکول سے تھکا ہوا آتا تو وہ میری مسکراہٹ دیکھتے ہی اپنی تکان بھول جاتا تھا۔ ان کے آتے ہی آگے بڑھ کر ان کی پیشانی پر اس طرح بوسہ دیتی کہ ان کی ساری تکان بھی مسکراہٹ میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ تینوں چھوٹی بہنیں تو میرے گلے سے جھول جاتی۔ بھائی چونکہ خود ذہین تھے لیکن پھر بھی اپنی اپنی مشکلات مجھ سے ہی حل کراتے تھے۔ امی کو میری شادی کی فکر ستانے لگی تھی کہ جلد ہی سنجیدہ کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ تلاش کر سنجیدہ کو اپنے گھر کی کر دوں۔ ایک روز امی نے ابو سے کہا۔

''کیوں ایسا کرتی ہوں سنجیدہ کے ساتھ ہی خالدہ کو بھی لگا لو۔ دونوں بچّیاں اپنے گھر کی ہوجائے تو مجھے سکون آجائے گا۔ وقت رہتے اگر بیٹیوں کی شادی ہوجائے تو بہت بہتر ہوتا ہے۔''

ابو نے سگریٹ سُلگاتے ہوئے کہا۔

''جیسی تمھاری مرضی''۔

ابو کے اس بے فکر رویے سے امی کی زمینداری اور بڑھ گئی تھی۔ اس لیے امی بس دن اور رات اسی فراق میں لگ جاتی ہیں کہ جلد یہ کام پورا ہو جائے۔ میرے سبھی بھائی بہنوں کو یہ فکر ستانے لگی تھی کہ اگر سنجیدہ باجی اپنی سسرال چلی گئی تو پھر۔

''اپنی مسکراہٹ سے ہمارا استقبال کون کرے گا۔؟'' ہم کس سے اپنی پریشانیاں حل کرائیں گے؟۔''

امی نے ان سب کی جائز فکر کو دیکھتے ہوئے سبھی کو ایک ساتھ بیٹھا کر شفقت سے ہاتھ پھیر کر سمجھاتے ہوئے کہا ۔

''بچّوں، بیٹی کو تو ایک نہ ایک دن جانا ہی ہوتا ہے۔'' ہم ان کو کب تک روک سکتے ہیں؟''

امی نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا ۔

''بس یہی دعا ہے کہ ان کے نصیب بلند ہوں۔''

بہت جلد امی کی تلاش بھی پوری ہوگئی انھوں نے میرے ساتھ خالدہ کے لیے بھی اچھا رشتہ تلاش کر دونوں کو خوشی خوشی اپنے گھر سے رخصت کر دیا۔

یوں آج اس گھر کی مسکراہٹ فاضل کے گھر کی زینت بن گئی ۔ میں فاضل کی دلہن بن کر اس کے گھر آ گئی۔ فاضل بہت ہی محنتی تھے۔

اکثر وہ کام کے سلسلے میں زیادہ تر کلکتہ شہر میں ہی رہتے تھے۔ آگرہ میں صرف جوتے کا مال خریدنے کی غرض سے ہی رُکتے تھے۔

سسرال میں مجھے زیادہ تر اکیلے ہی رہنا ہوتا تھا۔ اس وجہ سے میرا اکثر وقت فاضل کی امی کے ساتھ گزرتا تھا۔ میری معصوم مسکراہٹ میں پوشیدہ درد کو وہ بخوبی سمجھتے ہوئے بھی وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتی تھیں۔

ایک روز میرا دل ٹٹولتے ہوئے فاضل کی امی نے مجھ سے کہا ۔

''بیٹا کچھ دن کی پریشانی ہے، بہت جلد فاضل کلکتے میں ہی فلیٹ لے لے گا۔ تب تم اور میں دونوں وہی چل کر رہیں گے۔ میں نے فاضل سے کہہ دیا ہے۔ میں اپنی نئی خاندانی بہو کو ایسے کرائے پر رہنے تھوڑے بھیج دوں گی۔''

یوں شوہر سے دور اور شوہر کا مجھے بالکل بھی وقت نہ دینا یہ سب باتیں مجھے پریشان ضرور کرتیں۔ لیکن یہ سب میں اپنی مسکراہٹ میں چھپا لیتی۔ ان کو زیادہ طول نہیں دیتی۔ میں اپنے دل کو سمجھا لیتیں۔

فاضل کام کے سلسلے میں ہی تو باہر گئے ہوئے ہیں ۔ جب میں اپنے میکے آتی تو امی اور سب ہی بہن بھائی مجھ سے فاضل کے بارے میں اس کے گھر والوں کے بارے میں پوچھتے تھے۔

تو میں اپنی مسکراہٹ سے ہی جواب دیتی۔

فاضل کے بارے میں، میں نے امی سے صرف اتنا کہا کہ۔

''فاضل کلکتے میں ہی رہتے ہیں ۔ ہاں وہ مجھ سے فون پر بات کرتے ہیں اور بہت جلد آنے کے لیے بھی کہہ رہے ہیں۔''

''اور امی جلدی ہی وہ مجھے اور اپنی امی کو بھی کلکتہ لے جائیں گے۔ پھر ہم دونوں بھی وہی رہیں گے۔ فاضل کے ساتھ۔''

میری ان باتوں سے امی کو بہت غصہ آیا اور فکر مند لہجے میں انھوں نے مجھ سے کہا۔

''سنجیدہ جب تک فاضل نہیں آ جاتے تم یہیں رہو اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ۔ وہاں تمھارے اکیلے رہنے سے مجھے دھڑکہ لگا رہے گا۔

امی کے چہرے پر فکر مند اثرات کو دیکھتے ہوئے میرے عکس پر پھر وہی مسکراہٹ آ گئی اور مسکراتے ہوئے میں نے امی سے کہا۔

''امی، میں آپ کی محبت اور فکر کی قدر کرتی ہوں۔ مجھے یہ بھی خیال ہے کہ آج بھی آپ مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتی ہو لیکن امی میرا گھر تو اب وہی ہے نہ۔؟

اور فاضل کی امی بھی تو وہاں تنہا ہیں۔؟ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اور رہی بات آپ کی بیٹی کی مسکراہٹ کی تو امی، آپ کی بیٹی کی مسکراہٹ کوئی چھین سکتا ہے بھلا۔؟''

میری باتوں سے امی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ لیکن امی کا دل یہ تو سمجھ ہی گیا تھا کہ میں ان سے کچھ چھپا رہی ہوں۔ لیکن کیا؟۔ یہ سمجھنا ان کے لیے دشوار ہو رہا تھا۔ مجھے دروازے تک رخصت کرتے ہوئے امی نے مجھ سے کہا ۔

''شادی سے پہلے تو فاضل کی امی نے مجھ سے کہا تھا کہ تمھاری بیٹی فاضل کے ساتھ ہی رہے گی۔ لیکن برادر کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کہتے کچھ اور ہیں اور کرتے کچھ اور''

امی کی ان باتوں سے مجھے خود پر ہی غصہ آنے لگا۔ پوری رات بس کروٹ بدلتی رہی۔ رہ رہ کر بس امی کی فکر ستا رہی تھی۔ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹتے ہوئے ذہن کہاں کہاں دوڑ رہا تھا۔ اسی فکر میں خود اپنی ذلت پر آنسو بہا رہی تھی۔ تکیہ آنسوؤں سے لبریز ہو رہا تھا۔ نظریں دیوار پر لگی

ہوئی ٹک۔۔۔ٹک۔۔ٹک۔۔۔۔۔کرچل رہی گھڑی پر تھی۔۔۔چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔میری درد بھری آہوں کا کسی کو اندازہ بھی نہیں تھا۔چونکہ رات قریب گیارہ بجے کا وقت ہو چلا تھا۔میں خاموش گھڑی کو دیکھتے ہوئے گہری فکر میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اچانک فاضل چلاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔

''سنجیدہ۔۔۔۔سنجیدہ،۔۔۔۔

تمھیں کچھ فکر بھی ہے۔شوہر کتنے دن بعد گھر آیا ہے۔؟''اس کا استقبال کرنے کے بجائے تم یہاں آرام فرمارہی ہو؟ میں یوں اچانک فاضل کو دیکھ کر خوش ہوگئی۔اپنے آنسوؤں کو دونوں ہاتھوں سے صاف کر چادر کو ہٹاتے ہوئے کھڑی ہوئی ۔میرے لیے یہ بہت خوشی کا مقام تھا اس تنہائی میں فاضل کا آنا کسی سرپرائز سے کم نہیں تھا۔میں نے فاضل سے تو کچھ نہیں کہا لیکن سیدھے اٹھی اور کچن میں جا کر فاضل کے لیے کھانا تیار کرنے لگی مجھے احساس تھا کہ فاضل تھک گئے ہوں گے۔گاڑی کی تکان اور پھر بھوک کی شدت۔۔۔جلد کھانا،تیار کر محبت وخلوص سے کھانا لگاتے ہوئے میں نے فاضل سے کہا۔

''آپ تھک گئے ہیں،پہلے فریش ہو جائیں پھر کھانا کھا لیجیے گا۔ میں نے آپ کے لیے کھانا لگا دیا ہے۔''اور بہت محبّت بھری نگاہوں سے فاضل کی طرف دیکھا کہ وہ کچھ کہے۔یا دو پیار بھرے الفاظ ہی فاضل مجھ سے شکریہ کے انداز میں کہیں گے۔لیکن فاضل اس کے برعکس ٹیبل پر رکھی چاول کی پلیٹ اس زور سے میرے منہ پر مار دیتے ہیں اور کچھ بڑبڑاتے ہوئے خود چادر تان کر سو جاتے ہیں۔

فاضل کے اس طرح کے رویے سے میری آنکھوں میں ایک دم اندھیرا سا چھا گیا۔دوپٹے سے اپنے منھ کو صاف کیا اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو جاری ہو گئے۔فاضل کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔ایسا کون سا میں نے غلط کام کیا ہے؟میں نے فاضل تمھارے لیے کھانا ہی تو تیار کیا ہے۔

''صرف اس پر فاضل تمھارا ایسا رویہ''

لیکن وہ تو گہری نیند میں سو چکے تھے۔اپنے دل کو تسلی دیتے ہوئے سمجھایا۔شاید فاضل زیادہ ہی تھک گئے ہیں؟

اپنی جائز فکروں کو اپنی مسکراہٹ میں جذب کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ فاضل کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ان کی طرف دیکھا پر وہ سو چکے تھے۔یہ سوچ کر رسیو کیا کہ شاید کوئی ضروری کام ہوگا۔میں ہیلو بھی نہیں کہہ پائی تھی کہ دوسری طرف سے ایک بے چین سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔آواز کسی خاتون کی تھی۔

''فاضل.....فاضل.تم کہاں ہو۔؟''

جیسے بھی ہو تم جلدی آجاؤ.ہماری بچّی کی طبیعت بہت نازک ہے ...بس تم جلدی آجاؤ۔۔''

میں نے اس خاتون کو تسلی بخش کلمات کے لیے جیسے ہی کچھ کہنا چاہا کہ دوسری طرف سے فون کٹ گیا۔

اور میں ہیلو۔۔۔۔ہیلو۔۔ہی کرتیں رہ گئی۔''اتنی رات کو کس کا فون ہو سکتا ہے۔؟وہ خاتون فاضل کو کیوں بلا رہی ہیں۔؟''فاضل کیا ڈاکٹر کو لے کر جانے والے تھے،ان کے پاس؟اور وہ یہ کیوں کہہ رہی تھی کہ ہماری بچّی؟''کیا ان کی بچی کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟

ان سارے سوالات نے مجھے گھیر لیا۔خود کو تسلی دینے کی کوشش کرتی رہی آخر کار صبح ہوگئی ۔جیسے ہی فاضل نیند سے بیدار ہوئے،میں ایک دم سے سہم سی گئی کہیں فاضل پھر سے مجھ پر غصہ نہیں کریں۔لیکن فاضل میری سوچ کے برعکس بہت نرمی سے پیش آتے ہیں ۔انھوں نے مجھ سے کہا۔

''سنجیدہ دیکھو اکثر مجھے کام کے سلسلے میں باہر جانا ہوتا ہے۔اور اکثر وقت بھی میرا وہی گزرتا ہے۔''مجھے سنجیدہ۔

...وہ اپنی بات ختم ہی کر رہے تھے کہ تب ہی باہر سے آواز آئی۔''فاضل...فاضل۔''

''جی ہاں۔''

کہتے ہوئے وہ چلے گئے ہیں۔فاضل کے دوبارہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے میں نے ان کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔

فاضل۔...رات کو لیکن فاضل مجھ سے کچھ کہے بغیر ہی اپنا بیگ اٹھا کر جانے لگے۔میں بار بار اصرار کر رہی تھی کہ پہلے وہ میری بات سن لیں۔

لیکن فاضل بے توجہی اختیار کیے ہوئے تھے اور میری بات بغیر سنے،مجھے اس زور سے دھکّا دیتے ہوئے چلے گئے۔میں روتے ہوئے اپنا سا منھ لے کر رہ گئی۔چونکہ اب یہ نئی بات نہیں تھی فاضل جب بھی گھر آتے۔اسی طرح کا رویہ اختیار کرتے۔میری سمجھ میں نہیں آتا تھا فاضل یہ سب کیوں کرتے ہیں۔؟لیکن میں یہ سب کسی سے کہہ بھی تو نہیں سکتی تھی۔؟امی خواہ مخواہ پریشان ہو جائیں گی اور فاضل کی امی کا میری باتوں پر یقین کرنا ناممکن ہے۔''میں کس سے کہوں۔۔؟''!!

نئے پرانے خیالات مجھے گھیر لیتے ہیں۔میں نے اپنے دل کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے شاید فاضل کام کے سلسلے میں ہی کسی سے بات کرتے ہوں۔صرف۔۔۔موبائل سے میں کیسے معلوم کرسکتی ہوں کہ وہ خاتون جس سے فاضل بات کرتے ہیں۔وہ فاضل کی کون لگتی ہے ؟۔۔۔کیا رشتہ ہے فاضل سے ان کا؟۔۔"

وقت گزرتا گیا اور میں ایک بیٹے کی ماں بن گئی لیکن باپ بننے کے بعد بھی فاضل کے رویے میں تبدیلی نہیں آئی۔ہاں،فاضل باپ بن کر خوشی ضرور ظاہر کرتے۔لیکن میرے ساتھ فاضل کا رویہ وہی رہا ہے۔ایک دن فاضل گھر آئے ہوئے تھے وہ اپنا موبائل فون کمرے میں چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے کمرے سے باہر گئے کہ اسی نمبر سے فون آتا ہے۔فون اٹھا کر، میں نے ہیلو کہا۔وہی آواز سن کر گہری سانس لی،دل کر رہا تھا آج سب کچھ اس سے ہی پوچھ لوں۔لیکن میرے کچھ بھی کہنے سے پہلے ہی دوسری طرف سے شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے الفاظ نے میری مسکراہٹ ہی غائب کردی۔اس نے کہا۔

"فاضل،تم اپنے بیٹے کی محبت میں ہمیں بھول گئے ہو کیا؟۔۔۔!! یا اچانک سنجیدہ کی محبت جاگ اُٹھی ہے،؟۔"

اتنے میں فاضل نے پیچھے سے آکر میرے ہاتھ سے اپنا موبائل فون چھین لیا اور مجھے زور سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تمھاری ہمت کیسے ہوئی میرا موبائل چھونے کی !!!"

میں بس خاموش سی ہوکر رہ گئی۔اس وقت فاضل کی آنکھوں میں جس قدر غصہ تھا ان کی نظروں سے وہ صاف عیاں ہو رہا تھا۔جس کو میرے لیے بھی برداشت کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔اب میرا یہ شک بالکل یقین میں تبدیل ہو گیا تھا کہ فاضل کا اس عورت کے ساتھ بھی ضرور کچھ پختہ رشتہ ہے۔جب یہ سب مجھ سے برداشت کرنا مشکل ہو گیا تو میں نے امی کو پوری حقیقت سے آگاہ کیا سبھی بھائی بہنوں اور امی نے مجھ سے ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"سنجیدہ تم نے یہ سب مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟۔کیا ضرورت تھی تمھیں سب برداشت کرنے کی۔میری بچّی اپنی ماں سے تو کہا ہوتا۔۔۔!! میں بھی کتنی خراب ہوں۔۔۔۔اپنی بچّی کے دل کو نہیں سمجھ پائی۔۔!! اور اس فاضل کو تو میں دیکھ لوں گی۔میری پھول سی بچّی پر اتنے ظلم؟۔وہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو؟۔!!!"

امی اور بھائی اس خاتون کی تحقیق میں لگ گئے۔میں نے فاضل کے موبائل سے جو نمبر نوٹ کیا تھا وہ بھی امی کو دکھایا جس سے اس خاتون کو تلاشنے میں امی کو مدد ملی۔اور مجھے یقین ہو گیا کہ بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔اور امی سب ٹھیک کردیں گی۔لیکن اس کے برعکس فاضل نے ہم پر الٹا مقدمہ کردیا کہ ہم اس کے گھر سے زیورات اور نقدی کے ساتھ اس کے بچّے کو بھی اپنے ساتھ میکے لے گئے ہیں چوری سے۔

امی نے بھی اس عورت کی پوری تحقیق کرڈالی۔امی کی تحقیق کے مطابق فاضل کا اس عورت سے رشتہ بہت پرانا تھا اور اس کی دو بچّیاں بھی ہیں۔جب ہمارا فاضل کے ساتھ عقد بھی نہیں ہوا تھا تب ہی فاضل دو بچّیوں کا باپ تھا۔امی فاضل کو کوستے ہوئے کہتی ہیں۔

"کم بخت تو نے میری پھول سی بچّی کی زندگی کیوں برباد کی۔ جب تو پہلے سے ہی شادی کرچکا تھا۔!!! کیا ضرورت تھی تجھے نکاح کی؟"

اور امی نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میری بچّی تمھیں کچھ بھی برداشت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔۔۔!!!۔دیکھنا،میں اس فاضل کی زندگی سے اس عورت کا بھوت کس طرح نکالتی ہوں۔تم تو بالکل معصوم ہو۔"

ان کے ان الفاظ نے مجھے حوصلہ دیا۔میں نے امی سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"امی کیا فاضل کے دل میں اپنے بچّے کی بھی محبت نہیں؟۔کیسے باپ ہیں وہ۔؟"

پختہ ثبوت کے ساتھ امی نے بھی فاضل پر مقدمہ درج کردیا۔لیکن فاضل اپنے فیصلے پر اٹل رہے۔بہت طرح سے ان کو سمجھایا گیا ہے۔لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔میں بھی اب روز روز کی ان تکلیفات سے پریشان ہوگئی تھی۔مقدمے کی ہر تاریخ میں مجھ سے طرح طرح کے سوالات پوچھے جاتے۔جس نے مجھے بالکل کمزور کردیا تھا۔اس لیے میں فاضل کے دعوے کے مطابق عدالت کے کہنے پر فیصلہ کر طلاق لینے کے لیے تیار ہوگئی تھی۔فاضل کو جب خبر ملی تو وہ بہت خوش ہوئے۔یہ خبر سنتے ہی فاضل ایک روز ہمارے گھر آئے۔جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ فاضل آئیں ہیں میں ایک دم سے بہت خوش ہوگئی کہ شاید فاضل مجھے لینے کے لیے آئے ہیں ان کے دل میں باپ کی محبت جاگ اُٹھی ہوگی۔؟" میرے پاس آکر فاضل نے مجھ سے کہا۔

"سنجیدہ۔تم نے بہت صحیح فیصلہ لیا ہے۔دیکھوں،تم میرے اور اس کے بارے میں سب جانتی ہو۔میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں۔ اور میری دو بچّیاں بھی ہیں۔سنجیدہ،تم سے پہلے وہ میری زندگی میں آئی ہے۔میں سچ کہہ رہا ہوں سنجیدہ تم سے شادی سے پہلے میں نے اپنے گھر میں یہ بات بتائی تھی۔اور سنجیدہ تم یقین مانو،میری امی نے میرے نا چاہتے ہوئے بھی زبردستی میری تم سے شادی کرا دی تھی۔اس لیے میرا کوئی قصور

نہیں۔ میں تمھارا قصور وار نہیں!۔۔اور ہاں سنجیدہ ...تم بھی کہیں اپنا گھر بسا لینا۔اس سے ہم سب خوش رہیں گے۔ تمھیں بھی کچھ برداشت نہیں کرنا ہوگا۔''

وہ کہے جا رہے تھے اور میں خاموش بس سنے جا رہی تھی ۔ فاضل کے منھ سے یہ الفاظ سن کر بے ساختہ حیران ہو رہی تھی ۔ مجھے رہ رہ کر صرف ایک بات ستا رہی تھی کہ ''وہ کس سادگی سے یہ بات کر رہے ہیں ۔ان کو احساس تک نہیں؟ ان کو اپنی بچّیوں کی تو فکر ہے لیکن اپنے بچّے کی فکر نہیں۔ ؟ فاضل کیسے باپ ہیں؟''

تب ہی امی کمرے میں داخل ہوئیں اور فاضل کو دیکھ کر آگ بگولا ہوگئیں۔ فاضل کو دھکّے مار کر اپنے گھر سے بھگا دیا۔

یوں میری اور فاضل کی طلاق ہوگئی ۔اور عدالت کے فیصلے کے مطابق بیٹا میرے پاس ہی رہا۔

صرف وہی تو تھا جو میرے جینے کی وجہ تھا نہیں تو میں پوری طرح سے ٹوٹ چکی تھی ۔ میری وہ معصوم مسکراہٹ نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔

امی بھی بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر مایوس سی ہوگئی تھی ۔ جوان بیٹی گھر میں ۔ یہ دیکھ کر امی کو گہرا صدمہ ہوا ۔ اس لیے امی کی طبیعت بہت خراب رہنے لگی تھی ۔۔۔ان کو یہ صدمہ اندر ہی اندر کمزور کر رہا تھا کہ وہ میرے ساتھ انصاف نہیں کر پائیں ۔ اس فکر میں امی کے خون کا دوران اتنا تیز ہوگیا کہ ڈاکٹر کے مطابق اگر بہت جلد اس کو کنٹرول نہیں کیا گیا تو کچھ بھی ہوسکتا تھا۔۔۔

ڈاکٹر ان کو خوش رہنے کی صلاح دیتے ہیں۔

اس لیے وہ بہت جلد میرا دوسرا نکاح کر کر پھر سے میرا گھر بسا نا چاہتی ہیں ۔لیکن میں اب یہ بالکل نہیں چاہتی تھی ۔۔۔ چونکہ فاضل کی حرکتوں سے میرا مرد ذات سے ہی بھروسہ اٹھ گیا تھا ۔ اب میں کسی بھی رشتہ میں نہیں بندھنا چاہتی تھی اور یہی بات میں امی کو بھی سمجھانا چاہتی تھی ۔ میں نے امی سے کہا ۔

''امی ایک دفعہ تو میں نے یہ سب برداشت کر لیا۔لیکن ،اب یہ سب دوبارہ۔۔۔۔نہیں۔!!!

امی اگر آپ بھی مجھے ہمت نہیں دیں گی تو میں بکھر جاؤں گی ۔امی .....اور...میرا کیا ہوگا....اگر آپ مجھے نہیں نبھا لوگی ۔ آپ مجھ سے کچھ بھی نہیں کہو اب میرا انس ہی میرے جینے کی وجہ ہے۔''

بیٹی کو اس قدر ٹوٹتا دیکھ کر امی مجھے گلے لگا لیا اور مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں بیٹا... ۔جیسی تمھاری مرضی ۔اسی میں ہی ہم بھی خوش ہیں۔''

امی نے مجھے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''سنجیدہ، تمھیں کوئی ضرورت نہیں فکر کرنے کی اپنی امی پر یقین رکھو خدا تعالیٰ جب امتحان لیتا ہے تو پوری شدت سے لیتا ہے۔ چونکہ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ میرا بندہ کس حد تک مجھ پر یقین کرتا ہے۔اللہ تمھارا امتحان لے رہا ہے۔ میری بچّی۔''

میں نے امی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔''امی اگر آپ ساتھ ہو تو مجھے کسی بھی امتحان سے ڈر نہیں لگتا ہے۔''

امی نے مجھے مسکرانے کی ہدایت کرتے ہوئے کہا۔

''میں ہر طرح سے تمھارے ساتھ ہوں بیٹا۔''

ایک رات امی کو اچانک درد اٹھا پورے جسم میں ۔اندر ہی اندر ان کو اتنی بے چینی محسوس ہوئی کہ وہ بے ہوش ہوگئیں سبھی بھائی بہن گھبرا گئے ۔ یہ اچانک امی کو کیا ہوا ۔؟ آناً فاناً میں امی کو ہاسپٹل لے کر پہنچے کچھ ضروری ٹیسٹ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے ہم سے کہا۔

'' آپ کے پیشنٹ کے اندرونی اعضا ٹھیک سے کام نہیں کر پا رہے ہیں۔کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ کافی وقت سے ان کا خون کا دوران بہت تیز رہنے کے سبب ان کے گردے پوری طرح سے فیل ہو چکے ہیں۔''

آپ ان کو جلد شہر سے باہر دہلی لے کر جایئے۔''

میں ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق بھائی کے ساتھ راتوں رات دہلی لے جانے کے لیے تیار ہوگئی۔

اور ہاسپٹل کی گاڑی سے ہی ہم نکل چکے تھے۔منزل بس قریب ہی تھی کہ امی نے گاڑی میں ہی آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور مجھ سے کچھ کہنے کے لیے منھ کھولا لیکن صرف ۔۔سنجیدہ...ہی کہہ پائی تھیں ۔۔ کہ ان کی زبان ان کا ساتھ نہیں دے سکی ۔بس سنجیدہ ۔۔سنجیدہ کہتے ہی امی نے اپنی آخری سانس پوری کی جیسے وہ مجھ سے کہنا چاہتی ہو کہ۔

''بیٹا میں بھی تمھارا ساتھ نہیں دے سکتی ۔اور تمھیں یہ امتحان خود ہی دینا ہوگا ۔اس جھوٹی مسکراہٹ کے سہارے ہی زندگی بسر کرنی ہے۔ اور خود اکیلے ہی اپنا، اپنے بچّے کا اور میرے بچّوں کا، بھی خیال رکھنا ہے۔۔!!!''

Ms. Mehmooda Qureshi
22/78 Dholi Khar Mantola
Agra Fort
Agra-282003 (U.P)

حسنِ سخن

غزلیں

ڈاکٹر نفیس بانو

دل ٹوٹنے کی مجھ کو صدا یاد ہے اب تک
آنکھوں سے ایک قطرہ گرا یاد ہے اب تک

غربت کے خارزار تھے جب گھر سے نکلے ہم
ہونٹوں پہ ماں کے تھی جو دعا یاد ہے اب تک

یہ چاند تارے راہ میں آنکھیں بچھائیں گے
خود اعتمادی نے جو کہا یاد ہے اب تک

اُس شہرِ آرزو سے جو نکلی تو آنکھوں میں
چھائی تھی کیسی کالی گھٹا یاد ہے اب تک

ایوانِ دل تھا موجِ سُنامی کی زد میں جب
رو رو کے مانگنا وہ دعا یاد ہے اب تک

دنیا نے ایسے جال بچھائے تھے چار سو
وہ اس کی شاطرانہ ادا یاد ہے اب تک

Dr. (Mrs.) Nafees Bano
Guest Faculty, Deptt. of Urdu
Banaras Hindu University
M.G. Kashi Viddiya Peeth
Varanasi-221002 (U.P)

عنبرین فاطمہ

ہونٹ مقفل ہیں رسموں پہ واری گئی
جب سے حوا زمیں پہ اتاری گئی

رنگ قربانی کا مجھ پہ گہرا بہت
ہائے مقتل کی جانب پکاری گئی

رات تقدیر سے میری لپٹی رہی
اس سیاہی سے میری نہ یاری گئی

داغِ قسمت سے روشن یہ میری جبیں
بوجھ جھومر کا رکھ کر سنواری گئی

صبر سے جبر تک کی مسلسل گھڑی
جو گزرتی نہیں وہ گزاری گئی

اس کی آنکھوں میں تھی زندگی کی چمک
وہ جو جینے کی چاہت میں ماری گئی

Ms. Ambreen Fatima
Uttar Bihar Gramin Bank Campus
Bagmali ,Sanchipatti
Hajipur-844101(Bihar)

نوشین تبسم

میں اس لیے خاموش رہتی ہوں

اگر میں اظہار کر دوں
جواب دے دوں
جو میرے دل میں ہے
تو پل میں بکھر جائے گا
رشتوں کا گھر
آسمان ٹوٹ جائے گا
گر جائیں گی
مُحبت کی دیواریں
میں اس لیے
خاموش رہتی ہوں

روز کرنا پڑتا ہے
سامنا مسائل کا
دل کے ارمان کچل کر
سمجھوتہ
غموں سے کرتی ہوں
بھول جاتی ہوں
حقیقی ہنسی کو
ذمہ داری کو میں
سمجھتی ہوں
دامن صبر تھام لیتی ہوں
ہار کر بیٹھنا نہیں مجھ کو
مل ہی جائے گی
ایک دن منزل
بس یہی سوچ کر
مصروف رکھتی ہوں
خود کو

تخلیقی عمل میں،
جو مجھے احساس
نہیں ہونے دیتا
تنہائی کا،
وقت رکتا ہے کہاں
گزر جاتا ہے
میں اس لیے
خاموش رہتی ہوں

Nausheen Tabassum
Sayyed Kaleem
Chikhliroad'
Amdapur'
Dist-Buldana-444301 (M.S)

لذیذ پکوان

یاسمین بانو

آلو کے پکوڑے

اجزا: دو بڑے آلو
دو کپ بیسن
ایک چوتھائی کپ چاول کا آٹا یا مکئی کا آٹا
نمک حسب ضرورت، دو چٹکی ہنگ، تھوڑی ہلدی
ہرا دھنیا باریک کٹا ہوا
ایک چوتھائی چائے کا چمچ اجوائن یا زیرہ۔

ترکیب: آلو کے پتلے پتلے سلائس کاٹ لیں. سلائس کو پانی سے اچھی طرح دھونے کے بعد کپڑے پر پھیلا دیں تا کہ پانی جذب ہو جائے۔

اب بیسن کا گھول تیار کریں. بیسن میں چاول کا آٹا یا مکئی کا آٹا، نمک، ہینگ، ہلدی، ہرا دھنیا اور اجوائن یا زیرہ سب ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں. گھول نہ زیادہ پتلا ہونے دیں نہ ہی زیادہ گاڑھا. اب گھول میں دو ٹیبل اسپون گرم تیل شامل کریں۔

کڑھائی میں تیل اچھی طرح گرم کرنے کے بعد آلو کے سلائس گھول میں ڈبو کر تل لیں۔ آلو کے گرما گرم پکوڑے تیار ہیں۔

مونگ دال پکوڑے

اجزا: ڈیڑھ کپ مونگ دال، ایک پیاز باریک کٹی ہوئی، دو ٹیبل اسپون کٹی ہوئی ہری مرچ، ہرا دھنیا باریک کٹا ہوا، آدھا چمچ لال مرچ

پاؤڈر، دو ٹیبل اسپون دھنیا پاؤڈر، ایک ٹیبل اسپون زیرہ، ایک ٹیبل اسپون چکن مسالہ یا گرم مسالہ نمک حسب ضرورت، دو ٹیبل اسپون بیسن، ایک ٹیبل اسپون مکئی کا آٹا، دو چٹکی بیکنگ پاؤڈر

ترکیب: مونگ دال ایک گھنٹے کے لیے بھگو دیں۔ اس کے بعد اچھی طرح دھوکر دو ٹیبل اسپون دال الگ رکھ دیں۔ اب باقی دال گرائنڈر میں درردری پیس لیں۔ پیسنے کے بعد الگ رکھی ہوئی دو ٹیبل اسپون دال، پیاز، ہری مرچ باریک کٹا ہرا دھنیا، سوکھا دھنیا موٹا پسا ہوا، زیرہ، چکن مسالہ یا گرم مسالہ، نمک، مکئی کا آٹا بیکنگ پاؤڈر۔ سبھی اشیا اچھی طرح ملالیں اور گاڑھا پیسٹ تیار کرلیں۔ کڑھائی میں تیل گرم کر کے چھوٹے چھوٹے پکوڑے تل لیں۔

پیاز کے مزیدار پکوڑے

اجزا: دو بڑی پیاز باریک کٹی ہوئی، دو ہری مرچ باریک کٹی ہوئی، ایک ٹیبل اسپون ادرک لہسن کا پیسٹ، باریک کٹا ہوا ہرا دھنیا، تھوڑا زیرہ، دو ٹیبل سپون چاول کا آٹا یا مکئی کا آٹا

ترکیب: تمام اشیا اچھی طرح مکس کرلیں۔ اب اس میں تھوڑا تھوڑا پانی ڈال کر گاڑھا پیسٹ تیار کرلیں اور گرم تیل میں چھوٹے چھوٹے پکوڑے تل لیں۔

لچھے دار آلو پکوڑے

اجزا: تین بڑے آلو، دو ٹیبل اسپون چاول کا آٹا، نمک حسب ضرورت، ایک ٹیبل اسپون ادرک لہسن کا پیسٹ، دو ٹیبل اسپون مکئی کا آٹا، ہری مرچ باریک کٹی ہوئی، باریک کٹا ہوا ہرا دھنیا

ترکیب: آلو چھیل کر کِس لیں۔ کِسے ہوئے آلو تین مرتبہ پانی سے دھوئیں اور اچھی طرح نتھار لیں۔ اس کے بعد تمام اشیا کِسے ہوئے آلو میں شامل کر کے پکوڑوں کا پیسٹ تیار کریں اور تل لیں۔ لچھے دار آلو کے

پکوڑے تیار ہیں۔

کرسپی ویج پکوڑے

اجزا: (3-4) کٹوری مکئی کا آٹا، ایک کٹوری میدہ، ایک کٹوری بیسن، ایک میڈیم سائز کا پیاز، ایک میڈیم سائز کا آلو، ایک شملہ مرچ، تھوڑی پتہ گوبھی، دو ہری مرچ، تھوڑا لال رنگ، ایک چٹکی بیکنگ پاؤڈر، تھوڑا ہرا دھنیا، نمک حسب ضرورت

ترکیب: تمام سبزیوں کو باریک کاٹ لیں۔ باریک کٹی ہوئی سبزیوں میں تمام اشیاء اچھی طرح مکس کرلیں تھوڑا تھوڑا پانی ڈال کر گاڑھا پیسٹ تیار کرلیں اور درمیانی آنچ پر فرائی کرلیں۔

Mrs. Yasmeen Bano
Mohd-Arif Sir
Akbari Chowk Biyabani
Achalpur-444806 (M.S)
Mob: 9370090295

ڈاکٹر احسان رؤف

قے دوران حمل
(Vomiting in Pregnancy)

قے ایک علامت ہے،جس کا تعلق حمل(Pregnancy) سے ہوتا ہے یا حمل کے دوران کسی Gynecological Medical Surgical عوارضات(Complications) کی وجہ سے ہوتا ہے، جو کہ حمل کے دوران کسی بھی وقت ہوسکتا ہے۔حمل سے تعلق رکھنے والی قے کو حمل کی قے (Vomiting of Pregnancy) کہتے ہیں۔

اقسام(Types)

حمل کے دوران ہونے والے قے کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1۔ Simple Vomiting of Pregnancy
2۔ Hyperemesis gravidarum

Simple Vomiting of Pregnancy1

یہ عام طور پر خفیف(Mild) ہوتی ہے،اس کو Morning Sickness بھی کہتے ہیں۔اس صورت میں حاملہ کو صبح اٹھنے کے بعد قے کا احساس ہوتا ہے جس کو طبی اصطلاح میں غثیان(Nausea) کہتے ہیں۔قے کے احساس کے بعد قے یعنی Vomiting ہوجاتی ہے۔حمل کے شروعاتی دنوں میں ہلکی قے کا ہونا بہت ہی عام ہے،جس کو حمل کی علامت سمجھا جاتا ہے۔اس قے سے خواتین کی صحت پر کوئی مضر اثرات رونما نہیں ہوتے ہیں اور نہ ہی خواتین کی روزمرہ کی زندگی (Daily activities) پر کوئی اثر پڑتا ہے۔اس قسم کی قے تقریباً نصف حاملہ میں پائی جاتی ہے۔

علاج:

یہ قے عام طور پر حمل کے 12-14 ہفتے میں علاج یا بغیر علاج کے ٹھیک ہوجاتی ہے ۔ اس کے علاج کے لیے مریضہ کو یقین دہانی (Assurance) کرائی جاتی ہے بسکٹ، Dry Toast جیسی غذائیں دی جائیں،مسالہ دار اور چکنی غذاؤں سے پرہیز کرایا جائے۔ان تدابیر سے اکثر خواتین میں فائدہ ہوجاتا ہے۔اگر ان تدابیر سے فائدہ نہ ہوتو Pyridoxine اور Doxylamine جیسی دوائیں دی جاتی ہیں۔اس کے علاوہ مریضہ کو پھلوں کے عرق اور زیادہ پانی پینے کی ہدایت دی جاتی ہے۔

یونانی علاج

طب یونانی میں مفرد(Single) اور مرکب (Compound) ادویہ اس قسم کی قے میں کافی مفید ہوتی ہیں۔

☆ مفرد ادویہ میں مریضہ کو تمر ہندی (املی)، آلو بخارہ ،انار چوسنے کی ہدایت کی جائے۔

☆ مرکب ادویہ میں جوارش تمر ہندی 6 گرام، جوارش انارین، بعد غذائیں استعمال کرانا مفید ہے۔

☆پودینہ،ادرک کی چائے پینے سے قے میں فائدہ ہوتا ہے۔
☆خشک ادرک کے ٹکڑے کر کے چبانا بھی قے میں مفید ہے۔

غذا و پرہیز

صبح سو کر کے اٹھنے کے بعد خواتین کو آدھے گھنٹے تک بستر پر رہنے سے قے کے امکانات کم ہوجاتے ہیں۔ پھر ہربل چائے کا استعمال کرنے سے فائدہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ خواتین کو تھوڑے تھوڑے وقفے پر تھوڑا کھانا کھاتے رہنا چاہیے، زیادہ چکنے اور مسالہ دار کھانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

2Hyperemesis Gravidarum

یہ شدید (Severe) قسم کی قے ہے، جس میں خواتین کی صحت پر مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں اور خواتین کی روزمرہ کی زندگی بھی متاثر ہوتی ہے۔ اس قے کے نتیجے میں خواتین میں پانی کی کمی (Dehydration)، خون میں Potassium کی کمی، Metabolic Acidosis، وزن میں کمی جیسے عوارضات ہوسکتے ہیں۔ عصر حاضر میں اس قسم کی قے کے مریضوں میں کافی کمی آئی ہے۔ اب یہ حالت بہت ہی کم دیکھنے کو ملتی ہے۔

اسباب (Causes)

اس کے اسباب بھی یقینی نہیں ہے لیکن درج ذیل صورتوں میں یہ ہوسکتی ہے۔

1۔ یہ عام طور پر حمل کے پہلے تین مہینے میں ہوتی ہے۔
2۔ یہ پہلی Pregnancy میں زیادہ عام ہے۔
3۔ یہ عام طور پر کم عمر میں ہوتی ہے۔
4۔ ایسی خواتین جن میں Migraine یا Motion Sickness کی روداد ہو۔
5۔ Hydatiform Mole اور Mutiple Pregnancy میں یہ صورت عام ہے۔
6۔ حمل کے دوران خواتین میں hCG ہارمون کا افراز بڑھ جاتا ہے، جس کی وجہ سے Hypermesis gravidarum ہوسکتا ہے۔
7۔ بعض خواتین میں اس کا سبب نفسیاتی بھی ہوسکتا ہے۔
8۔ Hyperemesis gravidarum سے متاثرہ خواتین عام طور پر Hyperthyroidism سے بھی متاثر ہوتی ہیں۔

علامات (Symptoms)

Hyperemesis gravidarum سے متاثرہ خواتین میں پائی جانے والی علامات کو Early اور Late دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ا۔ شروعاتی علامات (Early Symptoms)

اس میں مریضہ کو قے پورے دن ہوتی ہے جس سے مریضہ کی روزمرہ کی زندگی متاثر ہوجاتی ہے۔ لیکن اس حالت میں جسم میں پانی کی کمی یعنی Dehydration نہیں ہوتا ہے۔

2۔ Late Symptoms

اس صورت میں قے بہت زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے مریضہ کے جسم میں پانی کی کمی (Dehydration) ہوجاتا ہے، پیشاب کی مقدار کم ہوجاتی ہے، پیٹ میں درد، قبض کی شکایت بھی ہوتی ہے۔ اگر اس

صورت میں علاج نہ کیا جائے تو مریضہ میں عوارضات (Complications) ہوسکتے ہیں۔ مریضہ کی زبان خشک ہوجاتی ہے، آنکھیں دھنس جاتی ہے، قلب کی رفتار طبعی سے زیادہ ہوجاتی ہے، اور بلڈ پریشر بھی کم ہوجاتا ہے۔ عصر حاضر میں عام طور پر یہ علامات نہیں پائی جاتی ہیں۔

تشخیص (Diagnosis)

سب سے پہلے بول (Urine) سے حمل کو یقین (Confirm) کرنے کی جانچ کی جاتی ہے، Ultrasonography کی مدد سے حمل کے دوران قے کے دوسرے اسباب کا بھی پتا کیا جاتا ہے۔ مثلاً Hydatiform Mole,Mutiple Pregnancy وغیرہ۔

علاج (Management)

☆اس کے علاج کے لیے سب سے پہلے مریضہ کے Dehydration کو ختم کرنے کی تدابیر کی جاتی ہے اس کے لیے مریضہ کو منہ کے ذریعہ سے 24 گھنٹے کچھ نہیں دیا جائے، اس دوران صرف Intravenous Fluids دیے جائیں۔ اس میں عام طور پر 3 لیٹر Fluid دیا جاتا ہے۔ جس میں Dextrose, Ringer Lactate وغیرہ دیے جاتے ہیں۔

☆ قے کو کم کرنے کے لیے دافع قے ادویہ مثلاً Promethazine, Prochlorperazine, Metoclopramide دئے جاتے ہیں۔ اگر مریضہ میں بلڈ پریشر طبعی سے کم (Hypotension) ہو تو اس صورت میں Hydrocortisone 100 mg IV دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ Vitamin B1, Vitamin B 6, Vitamin C, Vitamin B12 بھی مریضہ کو استعمال کرائے جاتے ہیں۔ مریضہ کی سماجی اور نفسیاتی مدد (Social andPsychological Support) بھی کرنا چاہیے۔

یونانی علاج

بطور علاج قے اور متلی روکنے کے لیے شربت انگور، شربت سیب اور شربت نارنج چٹائیں، اس کے علاوہ کھانے کے بعد جوراش عود شیریں 6 گرام استعمال کرائیں۔

حوالہ جات (References)

1۔ ڈی سی دتا، ٹکسٹ بک آف آبسٹیٹرکس، جے پی بردرس، نئی دہلی، 2015، صفحہ 180-184
2۔ حکیم سید محمد حسان نگرامی، علم القابلہ، اودھ پرنٹنگ پریس، لکھنؤ، 1991، صفحہ 106-109
3۔ پیٹسی ویسٹ کاٹ، الٹرنیٹو ہیلتھ کیئر فار ویمن، ڈائمنڈ، بکس، لندن، 1994، صفحہ 142-143
4۔ مولانا حکیم عزیز الرحمان اعظمی، وصی میڈیکل ڈکشنری انگلش۔ اردو، مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ، 2001، صفحہ 873

□□□

Dr. Ehsan Rauf
476/6C Behind Madeh Ganj
Police Chowki, Sitapur Road
Lucknow-226020 (U.P)

حسن کی نگہداشت

نیم کے پتے جسمانی مسائل کے حل میں مددگار

نیم کے پتے جو کہ ہمیں آسانی سے مل جاتے ہیں۔ اگر آپ اس کا استعمال کریں تو آپ بھی اس سے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ نیم اینٹی بیکٹیریل ہے اور اس میں وٹامن سی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو کہ آپ کے جلد کے امراض کے لیے نہایت مفید ہے۔ اکثر خواتین اپنے جلد اور دیگر مسائل کے باعث پریشان دکھائی دیتی ہیں اور وقت نہ ہونے کی وجہ سے خود پر دھیان نہیں دے پاتی ہیں۔ ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ آپ اس عام سے پتے کو استعمال کر کے کیسے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔

چہرے کے داغ دھبوں اور دانوں کے لیے معاون

نیم کے پتے چہرے میں موجود داغ دھبوں اور دانوں کو ختم کرنے میں مددفراہم کرتے ہیں۔ اس لیے جن کے چہرے پر داغ دھبے اور دانے ہوں وہ نیم کے خشک پتے لے کر اس کا سفوف بنالیں اور پھر اس میں پانی یا عرق گلاب کے چند قطرے ملا کر چہرے پر لگائیں پھر کچھ دیر بعد اس کو ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔

جسمانی امراض کے لیے مفید

نیم کے پتے ہماری جلد کی طرح ہمارے جسمانی امراض میں بھی مفید ہوتے ہیں۔ اس لیے ایسے افراد جن کے جوڑوں میں درد رہتا ہو وہ روزانہ نیم میں موجود نبولی کو پانی کے ہمراہ کھائیں۔ یہ عمل جوڑوں کے درد کی شکایت دور کرنے کے حوالے سے مددگار ثابت ہوگا ساتھ ہی نبولی کو چوسنے سے آپ کا خون صاف ہوگا اس کے علاوہ یہ قبض بھی دور کرنے میں مددفراہم کرتی ہے۔

مسوڑھوں کے انفیکشن کے لیے مفید

اکثر لوگوں کے مسوڑوں میں انفیکشن ہوجاتا ہے جو تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ایسے افراد نیم کے پتوں کو پانی میں ابالیں اور چھان لیں پھر اس پانی سے کلیاں کریں یہ عمل آپ کے مسوڑوں کے انفیکشن کے لیے معاون ثابت ہوگا۔

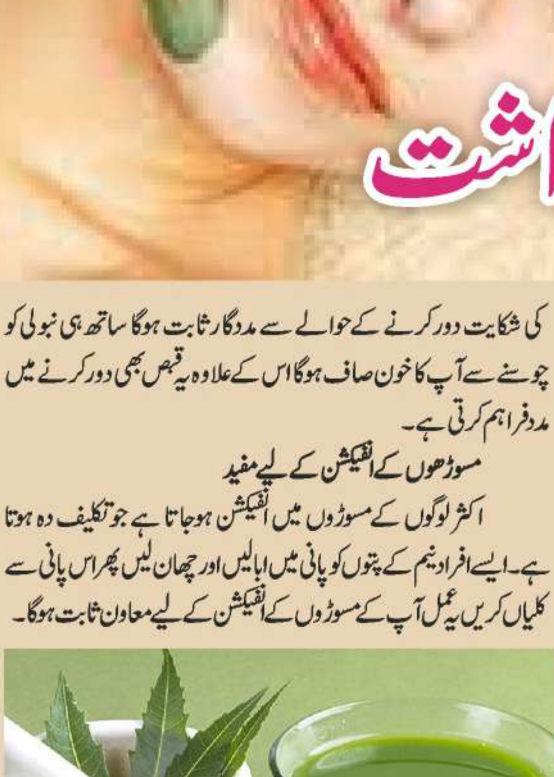

جھڑتے بالوں کے لیے مفید

اکثر خواتین بال جھڑنے کی شکایت کرتی ہیں یا بالوں میں خشکی ہونے کی وجہ سے بھی پریشان ہوتی ہیں تو ایسی خواتین شیمپو کے بعد نیم کے پتوں کو پانی میں ابال کر ٹھنڈا کرلیں اور شیمپو کے بعد اس پانی سے بالوں کو دھولیں۔ یہ پانی آپ کے بالوں کی جڑوں کو مضبوطی فراہم کرے گا۔

نیم کے پتے کڑوے ضرور ہوتے ہیں لیکن اس میں چھپے یہ فوائد انسانی جسم کے لیے نہایت مفید ہیں۔

بغیر کیمیکل کے بالوں کو ڈائی کریں

زندگی میں ایک عمر ایسی آتی جس ہے میں ہمارے بالوں کا رنگ بدلنے لگتا ہے اور ہمیں اپنی شخصیت کو سنوارنے کے لیے ہیئر ڈائی کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ بال ڈائی کرنا اب ایک فیشن بن چکا ہے بہت سے نوجوان لڑکے لڑکیاں بھی بالوں کی رنگت تبدیل کر کے نیا اسٹائل اپنا نا چاہتے ہیں۔ لیکن مختلف ہیئر ڈائز میں کیمیکلز کی موجودگی نا صرف بالوں کے لیے بلکہ جلد کے لیے بھی نقصان دہ ہوتے ہیں۔ نیشنل کینسر انسٹی ٹیوٹ کے مطابق ہیئر ڈائی میں استعمال ہونے والے بعض کیمیکلز کینسر کا باعث بھی بنتے ہیں۔

خوش قسمتی سے ایسے بہت سے قدرتی طریقے ہیں جو کوئی نقصان پہنچائے بغیر آپ کی شخصیت کو سنوار سکتے ہیں۔

مٹیالے بالوں کو گولڈن رنگنے کے لیے:

شہد میں قدرتی طور پر ہائڈروجن پرآکسائڈ موجود ہوتا ہے جس میں بالوں کو بلیچ کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور دار چینی میں بالوں کو سنہرا کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے (کالے یا براؤن بالوں کو سرخ شیڈ دینے کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔) برابر کی مقدار میں شہد دار چینی پاؤڈر اور کنڈیشنر یا زیتون کا تیل ملالیں۔ اچھی طرح ملا کر بالوں میں مساج کریں اور ایک گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ قدرتی طریقے سے بال ڈائی کرنے کے لیے یہ عمل کئی دفعہ دہرانے کے بعد صحیح نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

لائٹ براؤن سے ڈارک براؤن کے لیے

کالے اخروٹ کے چھلکے میں بال ڈائی کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے اور یہ دوسرے قدرتی اجزاء کے مقابلے میں زیادہ اچھے بال ڈائی کرتا ہے۔ کالے اخروٹ کے چھلکے کوٹ لیں یا اس کا پاؤڈر لے کر پانی میں ملا کر ۳۰ منٹ تک ابالیں۔ اس چائے کو ٹھنڈا کر کے بالوں کو اس میں کم از کم ۲۰ منٹ یا اس سے زیادہ دیر کے لیے بھگوئیں۔ مانگ کو رنگ سے بچانے کے لیے کھوپرے کا تیل مانگ میں لگالیں۔

ڈارک براؤن پر لائٹ براؤن شیڈ کے لیے:

کیمومائل کی چائے بھی بالوں کو سنہرا شیڈ دینے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ کیمومائل کو پانی میں ابال کر ٹھنڈا کریں اور بالوں کو اس سے بھگوئیں شیمپو کرنے کے بعد بار بار اس چائے کو بالوں پر لگائیں۔ (بالوں کے نیچے ٹب یا باؤل رکھیں تاکہ پانی اسی میں گرے اور دوبارہ استعمال ہو سکے) ایک گھنٹے کے لیے بالوں کو اس چائے سے گیلا کیے رکھیں اور پھر صاف پانی سے دھولیں۔ کیمومائل ٹی کو زیتون اور شہد کے تیل کے ساتھ ملا کر کنڈیشنر کے طور پر بھی استعمال کریں۔ ہفتے میں کئی دفعہ استعمال کرنے سے تین ہفتے میں بہتر نتائج سامنے آئیں گے۔

کسی بھی رنگ پر لال شیڈ کے لیے:

مہندی سے بالوں میں مختلف شیڈ آتے ہیں جس کا انحصار بالوں کی اصل رنگت پر ہوتا ہے اور دوسرے اس بات پر بھی کہ آپ بال ڈائی کرنے کے لیے کتنی مرتبہ اس کا استعمال کرتے ہیں۔ مہندی کا رنگ دو مہینے تک رہتا ہے۔ بال ڈائی کرنے کے لیے مہندی کو پانی میں گھول کر ایک دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں پھر بالوں میں لگائیں مہندی سوکھنے کے بعد دھولیں۔

ہلکی سفیدی چھپانے کے لیے:

بال ڈائی کرنے کے لیے ساج کے پتوں کا استعمال بھی کیا جاتا ہے یہ بالوں میں آنے والی ہلکی سفیدی کو ختم کر کے گہرے بالوں جیسا ہی کر دیتا ہے ساج کے پتے ابال کر اس میں کالی چائے ملا کر بالوں کو دھوئیں۔ اس کے باقاعدہ استعمال سے بالوں کا رنگ گہرا ہوتا جائے گا۔

(بحوالہ: www.kfoods.com)

□□□

تاثرات: نگر نگر سے

''خواتین دنیا'' ستمبر2021ءدستیاب ہوا۔اس کا سرورق معنی خیز ہے۔ ترسیمی پس منظر میں کتابوں کے انبار میں اعلیٰ ڈگری کے حصول کی خواہاں ایک طالبہ آف دی کلاس ورق گردانی میں اس سوچ میں غرق ہے کہ آف لائن تدریس کا آغاز کب ہوگا۔ یہی کچھ فکر یہ اداریہ سے عیاں ہے۔(ص4)

قطع نظر اداریہ کے اس شمارہ کے 62 صفحات میں بکھرے مشمولات لاجواب ہیں۔ان میں درجن بھر شہ سرخیاں ہیں جن کے ذیل میں کوئی ڈیڑھ درجن ذیلی سرخیاں جگمگا رہی ہیں۔ چلیے ان پر قدرے تفصیلی نظر ڈالتے ہیں۔

''شخصیت (ص 5 تا ص 9) میں ایک تحقیقی مضمون ''ڈاکٹر ثمینہ شوکت'' میں ڈاکٹر رؤف خیر نے ڈاکٹر ثمینہ کے پس پردہ کارناموں کو اجاگر کیا ہے۔اس کے مطالعہ سے یہ تحقیق در تحقیق سوانحی و ادبی تاریخی مقالہ لگتا ہے۔ پر اِسے تحقیقی دیانت داری سے تیار کیا گیا ہے۔ معیار اس کا بلند ہے۔''جہانِ نسواں'' (ص10 تا ص39) میں سات عدد بڑے اچھے اچھے مضامین لکھے گئے ہیں منٹو، قرۃ العین حیدر، مسرور جہاں پر لکھے مضامین اعادہ محسوس ہوتے ہیں۔البتہ ''ہندوستانی معاشرہ میں عورت سے منسوب محاورات اور کہاوتیں'' (ص28) قابل قدر مضمون ہے۔اس میں کوئی 33 محاوروں اور کہاوتوں کے مطالب بیان کیے گئے ہیں۔ ویسے ہی ''خواتین فرہنگ نویس کی فرہنگوں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' (ص34) میں کوئی نَو خواتین کے نام درج ہیں جنھوں نے فرہنگ یا لغات نویسی میں خاطر خواہ کارنامے انجام دیئے ہیں۔ فاضل مصنفہ نے ان خواتین کے محض اسماء یونہی نہیں گنائے ہیں بلکہ ان کے کارناموں کا غائر نظر سے تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا ہے۔ یہ مقالہ درحقیقت پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بڑا ہی علمی و معلوماتی کارنامہ ہے۔ یہ دونوں مضامین ''خواتین دنیا'' کے شایان شان ہیں۔''شناخت'' (ص40 تا ص42) کے تحت ڈاکٹر درخشاں تاجور کو درخشاں ستارہ قرار دیا گیا ہے۔ پڑھ کر دیکھ لیجیے شاید آپ قائل ہوجائیں۔''نکہت سخن'' (ص43) کے تحت آٹھ شاعرات کے منتخب یعنی چنندہ اشعار دیئے گئے ہیں۔ان میں رابعہ پنہاں کا یہ شعر بہت پسند آیا ؎

گزری تمام عمر خزاؤں کے درمیاں اب التفات فصل بہاراں کا کیا کروں

''افسانہ/کہانیاں'' (ص44 تا ص46) میں افسانہ ''امیدوں کا موسم'' درج ہے۔ دکھ درد کی داستاں میں کوئی نئی بات ہو تو بذریعہ خط ''خواتین دنیا'' کو آگاہ کردیجیے۔''ڈراما'' (ص47 تا ص49) کے تحت ڈرامہ ''صحرا سے نخلستان تک'' دیا گیا ہے۔ بالکل اسم بامسمہ ہے۔''حسن سخن'' (ص50 تا ص51) میں ایک اچھی نظم اور دو غنیمت غزلیں دی گئی ہیں۔''باورچی خانہ'' (ص52 اور 53 میں) لذیذ پکوانوں کی تراکیب دی گئی ہیں۔''صحت'' (ص54 تا ص56) میں قوت بخش اور لذت سے بھرپور غذاؤں سے روشناس کرایا گیا ہے۔ بدپرہیزی اور لاپرواہی قربِ علالت کی نشانیاں ہونگی، اس لیے اپنی صحت و عاقبت کی بقا کے لیے پرہیز و استغفار لازم ہیں۔''آرائش وزیبائش'' (ص57 اور 58) کے ذریعہ اپنی خوبصورتی کی نگہداشت کی جاسکتی ہے۔''تاثرات'' (ص59 اور 60) میں قارئین نے اپنے اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور اخیر میں ''خواتین خبرنامہ'' (ص61 اور 62) میں کھیلوں سے متعلق خبریں درج ہیں۔

مصطفی ندیم خاں غوری، زرّین ولا، بی-۱۱، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، (مہاراشٹرا)

یو پی ایس سی امتحان میں صدف چودھری نے نمایاں کامیابی حاصل کی

ستائیس سالہ صدف 'سرو یو پی گرامین بینک' کی دیو بند شاخ میں ملازمت کرنے والے اسرار احمد اور شہباز بانو کی بڑی بیٹی ہیں اور انھوں نے حالیہ یو پی ایس سی کے سول سروسز امتحان میں ہندوستان بھر میں 23 واں مقام حاصل کیا ہے، صدف مسلم امیدواروں میں سرفہرست رہی ہیں۔ یہ اتفاق ہے کہ اس سال یو پی ایس سی امتحان میں ملک بھر میں ٹاپ کرنے والے شبھم کشواہا کے والد بہار گرامین بینک میں منیجر ہیں، صدف سنیہا دوبے کی طرح فارین سروسز میں خدمات انجام دینا چاہتی ہیں اور انھیں کافی وقت سے جانتی ہیں۔ صدف نے اپنی ابتدائی تعلیم امروہہ سے حاصل کی اور اس کے بعد انھوں نے انجینئرنگ پنجاب کے جالندھر سے کی۔ صدف کی یہ دوسری کوشش تھی۔

صدف کی آل انڈیا رینک اور او بی سی کوٹہ کے پیش نظر ان کے پاس آئی ایف ایس حاصل کرنے کا بہترین موقع ہے۔ وہ مغربی اتر پردیش میں کاشتکاری کے لیے مشہور گھاڑا برادری سے تعلق رکھتی ہیں، جو پسماندہ طبقات میں شمار ہوتی ہے۔ آئی ایف ایس کے لیے انتخاب کے سوال پر صدف نے قومی آواز سے کہا ''ہاں اس کا امکان ہے اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ یو پی ایس سی میں میرا سبجیکٹ بین الاقوامی معاملات سے متعلق تھا۔''

صدف نے بتایا کہ میں نے سول سروسز کے لیے ملٹی نیشنل کمپنی کی جاب چھوڑ دی اور اس کے بعد 2 سال تک محنت کی۔ ظاہر ہے کہ میں یہاں

صرف ملک کی خدمت کے لیے آئی ہوں۔ آج ملک کی بیٹی سنیہا دوبے کی تعریف کی جا رہی ہے۔ یہ سمجھ لیں کہ میں بھی مستقبل کی سنیہا دوبے بننا چاہتی ہوں۔ پھر بھی اگر ملک کو لگتا ہے کہ میں آئی اے ایس کے طور پر بہتر کام کر سکتی ہوں تو میں اس کے لیے بھی ذہنی طور پر تیار ہوں۔

مزید یہ کہ صدف کے پاس یو پی ایس سی کی تیاری کے لیے کوئی بڑی حکمت عملی نہیں تھی۔ صدف بتاتی ہیں کہ ''صبح ناشتے کے بعد جب تک دل کرتا تھا میں مطالعہ کرتی تھی۔ ہفتہ وار ایک بار خود کا جائزہ لیتی تھی۔ مگر یہ سچ ہے کہ میں نے جو کچھ بھی کیا خود سے کیا اور بغیر کوچنگ کے کامیابی حاصل کی ہے۔

(قومی آواز ڈاٹ کام، 30 ستمبر 2021)

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم (ابتدا سے 1947 تک)

مصنف: حنیف کیفی

چوتھی اشاعت: 2021

صفحات: 580

قیمت 270 روپے

طب القانون وعلم السموم

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 666

قیمت: 295 روپے

اچھی صحت کا راز

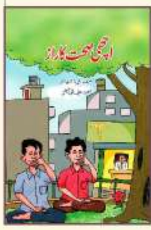

مصنف: فیروز بخت احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 16

قیمت: 20 روپے

کلیاتِ ذوق

مرتبہ: تنویر احمد علوی

پانچویں طباعت: 2021

صفحات: 456

قیمت: 240 روپے

کلیات امور طبیعیہ

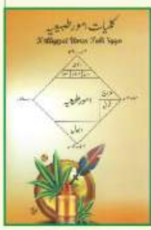

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 288

قیمت: 145 روپے

عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر وترقی

مصنف: دیوندر اسر، مترجم: شاہد پرویز

دوسری طباعت: 2021

صفحات: 173

قیمت: 105 روپے

تیمارداری

مصنف: حسین فاروقی

چوتھی طباعت: 2021

صفحات: 262

قیمت: 135 روپے

اسکرپٹ رائٹنگ عملی ہدایت نامہ

مصنف: اصغر وجاہت

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 101

قیمت: 75 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, नवम्बर -२०२१ वर्ष: ५, अंक: ११
Mahnama Khawateen Duniya Monthly November 2021, Vol. 5, Issue:11
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2021-23
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-11-2021
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6